رعایتی قیمت کی کتابوں کا اشتہار جو صفحہ ۲۳ پر درج ہے منسوخ سمجھا جائے گزشتہ ماہ میں بھی یہ اشتہار غلطی سے درج ہوگیا۔ نیاز

نگار

جلد ۲۷	فہرست مضامین جون ۳۵ء	شمارہ ۶

ملاحظات ——— ۲
عربوں کا شوق سیاحت اور ان کی تحقیقات جغرافی ——— بدر اصلاحی ——— ۹
دیر و حرم کے قصے ——— پنڈت کشن پرشاد کول ——— ۲۴
بندے ——— سید احمد حسن بی اے ——— ۳۲
کسبی ——— "ف" ——— ۳۵
قوتِ ارادی کے حیرتناک کرشمے۔ ——— محمد عطاء اللہ سنبھل ——— ۴۶
مصطفےٰ کمال ——— ۵۳
باب الانتقاد (مجموعہ منظومات جناب سیماب اکبرآبادی) ——— ۶۱
باب المراسلہ والمناظرہ۔ (مذہب شکن سوسائٹی) ——— سید تہور علی صاحب دلدارنگر ——— ۶۷
باب الاستفسار ——— ۷۰
مکتوبات نیاز ——— ۷۲
معلومات ——— عبداللطیف اعظمی ——— ۷۳
مطبوعات موصولہ ——— ۷۶
منظومات ——— اختر۔ شمیم۔ شفیقہ منظور ——— ۷۸

دہلی سے اختر ریحانہ کی ایک اور دلچسپ تحریر وصول ہوئی ہے جو جولائی کے نگار میں شائع ہوگی۔

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ٦	جون ۱۹۳۵ء	جلد ٢٧

ملاحظات

حوّا کی بیٹیاں ہندوستان میں

الہ آباد کا بیوہال تماشائیوں۔ نوجوان تماشائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سامنے ڈائس پر ایک طرف تمام وہ ساز جو ہندوستان کی موسیقی کا ساتھ دے سکتے ہیں قرینہ سے چنے ہوئے رکھے ہیں اور دوسری طرف چند نوجوان لڑکیاں اور چند بہت کمسن، حال و مستقبل کے تمام امکانات حسن و عشق لئے ہوئے جلسہ کے آغاز کا انتظار کر رہی ہیں۔ سیاہ بورڈ پر ایک لڑکی کے رقص کا اعلان نظر آتا ہے۔ اور ڈائس سے نیچے الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر بہ حیثیت ناظم جلسہ گھنٹی بجا کر آغاز کی اجازت دیتے ہیں۔

سازندے، تعلیم یافتہ سازندے اپنا اپنا ساز سنبھال کر ہم آہنگی کے ساتھ موسیقی کی پہلی آواز کھرج کے پردوں سے پیدا کرتے ہیں اور ایک لڑکی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ سال کی ہوگی۔ سر میں پھولوں کا ہار اور پاؤں میں گھونگھرو لپیٹے ہوئے سُم کی پہلی ضرب کیساتھ نمودار ہوتی ہے۔ گویا کہ ایک نوخاستہ تیتری ہے جو پو پھٹتے پیدا ہوئی اور سورج کی سب سے پہلی کرن پر رقص کرتی ہوئی یہاں پہنچ گئی ہے ــــ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی جنبش، اسکے ناتوان و کمزور اعضاء کی لرزش، فاختہ کی طرح اسکے چھوٹے چھوٹے سُرخ پاؤں سے لپٹے ہوئے گھونگھروں

کا باقاعدہ جھنکار۔ ایک ایسا سماں تھا جو حال سے قطع نظر اس کے امکانات مستقبل کو پیش کر رہا تھا۔ یہ لڑکی انھیں پروفیسر صاحب کی بچی جو اس جلسہ کے مہتمم و نگراں تھے۔

اس کے بعد اور چند چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی طرف سے نمائش فن ہوئی۔ اور بڑی حد تک کامیاب۔ لیکن اس کے بعد جب دفعتہً بورڈ پر "مس بنا پانی مکرجی" کا نام نظر آیا تو لوگوں کے احساس میں میں نے خاص اضطراب محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دبا ہوا جذبہ دل سے زبان تک آ ابلا ہے ——— جذبۂ بے اختیار شوق ———!

چودہ پندرہ سال کی ایک بنگالی لڑکی۔ بنگلی اپنے سانولے رنگ کے لحاظ سے۔ اپنے لانبے لانبے سیاہ بالوں کے لحاظ سے۔ بڑی بڑی آنکھوں اور کتابی چہرہ کے لحاظ سے ——— نازک قامت۔ لچیلا بدن۔ شرمائی ہوئی چتون۔ سُرخ ساری۔ سُرخ مہندی ——— ہارمونیم پر پتلی پتلی نازک انگلیوں کی متواتر جنبش اور ایک سادی لحن کیا تھا جو پوری کی دلدوز راگنی! معلوم نہیں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری تھی۔ لیکن میری روح کا اعتراف شکست اگر بیان میں آسکتا ہے تو وہ صرف یہ تھا کہ:۔

کفر چندیں سالہ گرمی آید ایماں می برد

آواز کی نزاکت کی تعریف مومن نے یہ کی ہے کہ

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں   اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

لیکن یہاں معاملہ صرف آواز کا نہیں تھا بلکہ لحن و موسیقی کا تھا۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بولوں کے اُتار چڑھاؤ کی نرم نرم پھانس دل کے اندر پیوست ہوتی جارہی ہیں۔ اور جب دفعتہً دوسری سپتک سے استائی کے بول ختم کرکے تان لیتی ہوئی کھرج کے پردوں تک آتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شعلہ لپکا اور پھیل کر رہ گیا۔ بجلی چمکی اور فضا کو منور کر گئی۔ یہ لڑکی بوکپور (بنگال) کی رہنے والی ہے۔ اور غالباً شانتی نکتین میں اس فن کی تکمیل کی ہے۔

شام کے جلسہ میں بوکپور کی دوسری لڑکی "مس سترا مصرا" نے اُس جدید فنِ رقص کی نمائش کی جو ٹیگور اسکول کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے اور جس کو موسیقی حرکات (Action Song) کہتے ہیں۔ اس نے اپنے رقص کے ذریعہ سے "شیو" کی اُن الہامیہ حرکات رقصیہ کو پیش کیا جو ہندو علم الاصنام کے شعبۂ فنون لطیفہ کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جس وقت اپنے پاؤں کو آہستہ آہستہ اُٹھاکر فرش کی طرف مائل کرتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سارے کرۂ ارض پر چھا جانا چاہتی ہے اور جب اپنے ہاتھوں کو بلند کرکے نرم و نازک انگلیوں کو اوپر کی طرف تان لیتی تھی تو اس کے لچیلے جسم کے تمام پیچ و خم کے ساتھ یہ منظر کچھ ایسی کیفیت کا اظہار کرتا تھا جو کہ عام رقص میں یقیناً کبھی نہیں پائی جاسکتی۔ اس لڑکی کے کتابی چہرہ کے نازک نقوش۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ اور کھنچی ہوئی بھوئیں۔ جو جذبۂ محبّت پرستی کی کھلی ہوئی علامتیں ہیں۔ اسوقت زیادہ تر ایک دیوی کی سی خودداری کو ظاہر کررہی تھیں اور جسم کے توڑ مروڑ کا تو یہ عالم تھا گویا اسکی ساخت میں صرف زاویوں اور خطوط منحنی سے کام لیا گیا ہے۔ خطِ مستقیم سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

دوسری شام کے جلسہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ اور انتہائی تباہ کن منظر وہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی نوجوان

صاحبزادی نے اپنے اکتسابات فنِ رقص کا مظاہرہ کیا۔ نوعیت اور شخصیت دونوں حیثیت سے یہ رقص اُس رقص سے یک گونہ جدا تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ کیونکہ وہ رقص خداوندی تھا اور یہ رقص بندگی۔ اگر اُس میں شیوہ کے غرور و پندار کو پیش کیا گیا تھا تو اِس میں ایک مُرلی کی سی پرستارانہ سپردگی و فنادگی کو۔ اُس میں صرف آرٹ تھا اور اِس میں آرٹ کیساتھ نسائیت بھی شامل تھی۔ اُس کو دیکھ کر روح دھڑکتی تھی اور اِس کو دیکھ کر دل!

اس لڑکی کا رنگ صاف۔ جسم صحیح و توانا۔ اور اعضا سڈول تھے۔ اس کے جسم کی جنبش اور حرکات رقصیہ کی لرزش بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی اور اگر چشم و ابرو کی سنجیدگی کو علیحدہ کر دیں تو اس میں تمام وہ کیفیتیں پائی جاتی تھیں جو انسان کو آرٹ سے زیادہ مطالعۂ حُسن کی طرف مائل کر دینے والی ہیں۔ مجھے اوروں کے احساس کی خبر نہیں لیکن کم از کم میں ضرور یہ خیال لیکر اٹھا کہ اکتسابِ فن کے لحاظ سے ایک اونچے گھرانے کی شریف لڑکی زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترقی کر سکتی ہے۔ لیکن جب نیسری شب کی صحبت میں مس آسا کماری نے اپنے معجزاتِ فن پیش کئے تو میں حیران رہ گیا۔ اور میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ جس قوم کی عورتوں پر "آج" اس طرح طلوع ہوا ہے اس کا "کل" کیا ہو سکتا ہے۔

اس دَور کی آزاد تعلیم یافتہ لڑکیوں کی عمر کا اندازہ کرنے میں ہمیشہ مجھ سے غلطی ہوتی ہے اور باوجود انتہائی احتیاط کے ہمیشہ دو چار سال آگے بڑھ جاتا ہوں۔ لیکن میرے ایک رفیق ہیں (بالکل میرے برعکس بجائے افراط کے تفریط کے عادی ہیں) ان کی رائے ہے کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیرہ۔ چودہ سال کی ہوگی۔ بہرحال اسکی عمر اتنی ہو یا اس سے بھی کم۔ اپنے احساس کے لحاظ سے وہ پیکرِ شباب و رعنائی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کلی، پھول بن جانے کے لئے صرف صبح کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے آتے ہی نہایت متین انداز سے کھڑے ہو کر پہلے ساز کی آوازوں پر غور کیا اور پھر سر کے اشارہ سے ان کو کسی مقررہ تال پر قایم رہنے کی ہدایت کر کے اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا کہ وہ کسی دیوی کا سنگین مجسمہ تھی جسکے حضور میں نغمۂ عبودیت گونج رہا تھا، جسکی پُوجا کرنے کے لئے اتنے لوگ جمع ہوئے تھے۔

آخر کار چند لمحوں کے سکوت و انتظار کے بعد اس خوبصورت مورتی میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک طرف جسم کو لچکا کر، کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس قدر نرمی و نزاکت سے آگے بڑھی گویا کہ طلوع صباح کا اوّلین احساس تھا، جو نسیم کے سب سے پہلے جھونکے کے ساتھ بجائے باصرہ کے روح و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ وہ آگے بڑھتی رہی، اپنے رنگین و نازک پنجوں کی ٹھوکر سے گھونگھروؤں میں ہلکی سی جھنکار پیدا کرتی ہوئی برابر بڑھتی رہی۔ یہانتک کہ سم آیا اور پاؤں کی پُر قوت ضرب سے گھونگھروؤں میں ایک ہنگامہ پیدا کر کے پھر اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا کہ وہ زمانہ کے انقلاب و سکون کا مطالعہ کر رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ عام بازاری عورتوں کی طرح اسکی چشم و ابرو کی جنبش میں کوئی پیامِ نوید نہ پایا جاتا تھا۔ اس کی کمر کی جنبش یا بدن کی تھرتھری میں طلبِ ہیجان کا کوئی سوقیانہ انداز مضمر نہ تھا۔ لیکن اگر سوال صرف تباہی و بربادی سے پناہ مانگنے کا ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اُن سے زیادہ بے پناہ نہیں۔ اور کس میں اتنا ضبط و تحمل ہے کہ اپنی قربانیاں پیش کرنے کے لئے طلب و تقاضا

کا انتظار کرے۔

اسکا صندلی رنگ اس وقت تکمیلِ فن کے پندار سے گلابی نظر آتا تھا۔ اسکی وسیع پیشانی پر ابروؤں کا خم ایک خود دارانہ احساس کو ظاہر کر رہا تھا جو کمال کی خصوصیت خاصہ ہے۔ اسکے پنکھڑی ایسے نازک لبوں کی لرزش خفی بتا رہی تھی کہ اسکے ناقابلِ ضبط جذبات میں ساز کے تاروں سے زیادہ نازک ارتعاش پایا جاتا ہے اور اسکے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم نازنین کی بار بار لچک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بجلی ہے جو تڑپ کر باہر نکل آنے کے لئے بے قرار ہے۔

اُس کے رقص میں نہ مس منزا کا آلہانہ انداز تھا۔ نہ مس بھٹاچاریہ کا سپاسگزارانہ۔ بلکہ یہ وہ کلاسکل چیز تھی جو موسیقی سے بہ حیثیت فن پیدا ہوئی اور جس کے بڑے بڑے علمبردار لکھنؤ میں کالکا اور بندا دین تھے۔ وہی توڑے اور وہی ماتروں کی تقسیم۔ وہی رامنگرانہ عشوے اور جذباتِ عشق کی تحلیل و تنظیم۔

الفاظ کیفیات کے اظہار سے قاصر ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان کبھی کسی آرٹ کی تکمیل کا اعتراف کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔

یہاں تک تو خیر صرف شاعری ہی شاعری تھی۔ لیکن اب آئیے کچھ لمحے اس غور و فکر میں صرف کریں کہ جس قوم کی عورتوں کی آزادی اپنی پہلی منزل میں یہ کیفیت رکھتی ہے وہ آئندہ کیا کرنیوالی ہے۔ اور اس دورِ نہضت (Renaisance) میں اس کے مستقبل کی توقعات کے متعلق کیا پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن لڑکیوں کی طرف سے رقص و سرود کا یہ بیباک مظاہرہ کیا گیا۔ وہ کسی ایسے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتیں جہاں اخلاق کے خون سے فن کا نشو و نما ہوتا ہے۔ بلکہ اس معزز و تعلیم یافتہ جماعت کی افراد ہیں جو قوم کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہے۔ اور جسے ہیئتِ اجتماعی کے نظام میں "دل و دماغ" ہونیکا مرتبہ حاصل ہے۔ اس لئے ہمارے دل میں قدرتاً جستجو پیدا ہوتی ہے کہ اس سے ان کا مقصود کیا ہے اور فطرت کی وہ کونسی ودیعتیں ہیں جو اس ذریعہ سے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

میں نے خود بھی غور کیا۔ بعض دیگر صائب الرائے حضرات سے بھی گفتگو کی۔ اور سب سے بہتر تاویل جو اسکی کی گئی وہ یہ تھی کہ رقص و موسیقی ہندوؤں کی مذہبی زندگی کا جزو لازم ہے اور اس دورِ ترقی میں ان کے دوسرے کلاسیکل فنون کے ساتھ اسکا ابھر آنا بھی ضروری ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے جہاں اپنی اور خصوصیاتِ معاشرت کو ترک کر دیا تھا انھیں میں سے ایک موسیقی بھی تھی۔ لیکن اب کہ مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ اس کے تمام باقی ماندہ اثرات بھی فنا ہو چکے ہیں اور ہندوؤں کا جذبۂ قومیت اپنی تمام روایاتِ دیرینہ و خصوصیاتِ سابقہ کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کی عورتوں میں ناچ گانے کا ذوق نہ پیدا ہو اور رادھا و کرشن کے اُس دور کی یاد تازہ نہ کی جائے جو بیک وقت ہندو

مذہب اور ہندو آرٹ دونوں کی جان ہے۔

میرے ایک دوست نے جو عورت اور پردہ کے باب میں پورے "فرعون" واقع ہوئے ہیں۔ نہایت ہی سخت استہزا کے ساتھ اعتراض کیا کہ اگر عورت کا رقص وسرود خالص مذہبی چیز ہے تو اسکی نمائش کی کوئی وجہ نہیں اور سر محفل اسکے مظاہرہ کی کیا ضرورت ہے میری رائے میں وہ تاویل اور یہ اعتراض دونوں غلط ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہندو جماعت میں رقص و موسیقی کا رواج یقیناً مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور وہ لڑکیاں جو پبلک میں اس فن کو پیش کرتی ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کے دل میں کوئی جذبہ تقدس واحترام پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال اس کے آرٹ ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ اور اسکی تکمیل کے لئے پبلک میں مظاہرہ ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی فن نقد و تبصرہ کی منزل سے نہ گذرے مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی اور تمام بت پرست قوموں کی طرح ہندوؤں میں بھی کسی وقت فنون لطیفہ عروج پر تھے۔ اور بعد کو جب اسلامی حکومت یہاں قائم ہوئی تو اُن کا زوال ضروری تھا۔ کیونکہ اسلام سے زیادہ دشمن اس چیز کا کوئی اور نہ تھا۔ لیکن اب کہ مسلمانوں کی تہذیب کا اثر بھی تقریباً معدوم ہو چکا ہے اور دوسری طرف مغربی معاشرت و معیشت کے زیر اثر آزادی و بیباکی عام ہوتی جارہی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہندو پھر اپنے ان قدیم فنون کی طرف متوجہ نہ ہوں جو خود تو فنا ہو چکے تھے لیکن ان کی روایات بدستور قائم تھیں۔

ہندو عورتوں میں اس فن کا ذوق زیادہ تر بنگال اور مدراس میں پایا جاتا ہے اور اسکا سبب صرف یہ ہے کہ مغربی آزادی کا اثر سب سے پہلے انھیں دو صوبوں نے قبول کیا۔ جس حد تک صرف موسیقی کا تعلق ہے مدراس کا دھرپد اسکول بہت قدیم چیز ہے اور دکھنی گوئیے اب تک اس پر قائم ہیں۔ رہ گیا بنگال سو اسکی اصل موسیقی پہلے جو کچھ رہی ہو مگر اب وہ خیال و ٹھمری کی موسیقی ہے جو غالباً واجد علی شاہ کے مٹیا برج جانے کے بعد وہاں رائج ہوئی اور اب اس کو غیر معمولی ترقی دیجارہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عورتوں کا اس طرف مائل ہونا بعض قدامت پرست حضرات کے نزدیک حد درجہ معیوب و مکروہ چیز ہے۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ اخلاقی خطرات بڑھ جانے کا بھی اس میں امکان ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عورت کا بے پردہ باہر آجانا اور جدید تعلیم کے زیر اثر اپنی انفرادی خودداری قائم کرکے مردوں کی طرف سے بے نیازانہ زندگی بسر کرنیکا جذبہ اس کے اندر پیدا ہو جانا کیا کم خطرناک ہے۔ اور اگر باوجود ان تمام خطرات کے اسکو دوبارہ پردہ کے اندر بٹھایا نہیں جاسکتا۔ اور تعلیم سے محروم نہیں رکھا جاسکتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ذوق رقص و موسیقی کی مخالفت کی جائے۔ اور وہ دیگر اکتسابات میں اسکو شامل کرکے اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے سے باز رکھی جائے۔

مسئلہ ازدواج میں اس وقت مرد کا رجحان جو صورتیں اختیار کرتا جاتا ہے اس نے عورت کو اپنی زندگی بدلنے پر مجبور کردیا ہے۔ اور وہ اچھی طرح سمجھنے لگی ہے کہ مرد کے ذوق کو آسودہ کرنے کے لئے اسے کیا کیا چھوڑنا اور کیا کیا اختیار کرنا ہے۔ پہلے مرد کی توقعات عورت کی طرف سے صرف یہ تھیں کہ وہ بچے کی پرورش کرے اور وقت پر کھانا تیار کردیا کرے۔ اور اسی لئے

تعلق جنسی کی خوشگواریاں زن و شو میں کوئی معنی نہ رکھتی تھیں۔ اور نہ دوسری تفریحی دلچسپیاں اس سے متعلق ہوتی تھیں۔ لیکن اب وہ زیادہ آزاد ہوگیا ہے۔ ترقی معاشرت نے اس کے انعطافات زندگی کو زیادہ وسیع بنا دیا ہے۔ اس کے جدید رجحانات گھر میں بیوی سے بھی انھیں دلچسپیوں کے متوقع ہیں جو اسے باہر حاصل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے وہ مجبور ہے کہ اپنی رفیق حیات کے انتخاب میں بھی انھیں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اور اگر کوئی لڑکی ان اکتسابات سے معرا ہوتی ہے تو اسکو شوہر ملنے میں حد درجہ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ انتخاب زن و شو کے مسئلہ میں صرف یہ بات دیکھی جاتی تھی کہ دونوں کے خاندان شریف ہیں یا نہیں اور شرافت نسبی کے علاوہ کسی اور بات کا لحاظ ہی نہ ہوتا تھا۔ یعنی لڑکی کی صورت و شکل بھی کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ سیرت و سلیقہ کا کیا ذکر ہے۔ لیکن اب مسلمانوں میں بھی جہاں آزادی و تعلیم نسبتاً بہت کم ہے۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے یا نہیں۔ اور فنون خانہ داری سے واقفیت رکھتی ہے یا نہیں۔

ہندوؤں میں چونکہ تعلیم بہت زیادہ ہے اور تعلیم کے ساتھ ان میں آزادی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے وہ لڑکی میں اب یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ فنون لطیفہ سے آگاہ ہے یا نہیں اور اس لئے اگر ہندو خاندانوں میں رقص و سرود کی طرف میلان بڑھتا جارہا ہے تو میں اسکو اقتضاء زمانہ کی مجبوری پر محمول کرتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ اگر کل کو مرد نے اس سے بھی زیادہ کوئی اور تمنا عورت سے متعلق کی تو وہ بھی اسے پوری کرنی پڑے گی۔

اس میں شک نہیں کہ فنون لطیفہ اور خصوصیت کیساتھ رقص و موسیقی کا ذوق عموماً جن جذبات کو ابھارتا ہے۔ وہ ضروریات زندگی سے اتنا تعلق نہیں رکھتا۔ جتنا عیش پسندی و تفریح سے۔ اور ظاہر ہے کہ اس ذوق کی فراوانی بے راہ روی کے بہت سے امکانات اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن جب مطلق تعلیم اور تعلیم کے ساتھ مطلق آزادی بھی خطرات سے خالی نہیں تو پھر خصوصیت کے ساتھ فنون لطیفہ کے اکتساب کی مخالفت کرنا اور تعلیم کے باب میں سکوت اختیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ لڑکیاں جو بالکل جاہل ہیں بہ نسبت تعلیم یافتہ لڑکیوں کے زیادہ آسانی کیساتھ دھوکہ میں نہیں آسکتیں۔ اور جو تعلیم کیساتھ فن رقص و سرود بھی حاصل کرتی ہیں ان میں لغزش کی زیادہ اہلیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اگر نفسیات انسانی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرد کا عورت سے یا عورت کا مرد سے مغلوب ہوجانا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مغلوب ہونیوالے کے مقابلہ میں فریق ثانی کسی خاص بات میں فایق و برتر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کسی معمولی شکل والی عورت کا خوبصورت مرد کی طرف مایل ہوجانا۔ کسی حسین مرد کا معمولی شکل والی لیکن قابل عورت پر فریفتہ ہوجانا۔ روز کی باتیں ہیں۔ اس لئے اگر عورت اپنے اکتسابات کے لحاظ سے بلند مرتبہ کی ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ یوں آسانی سے مغلوب ہوسکیگی۔ اور ہر کس و ناکس میں اس کے لئے کوئی جاذبیت و کشش نہ پائی جائے گی۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کی تعلیم و آزادی کو کیوں خطرناک بتایا جاتا ہے۔ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کو آزادانہ سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھ کر یا پبلک میں اس کے رقص و سرود سے متاثر ہوکر اگر مرد کسی ذہنی یا خیالی معصیت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اسکی کمزوری ہے۔ جو عورت کی اخلاقی کمزوری کو مستلزم نہیں۔ اور اس لئے میرے نزدیک عورتوں کی موجودہ ترقیوں کی

مخالف صرف انتقام ہے اُس جذبۂ نارسائی کا جو مرد کو بیتاب و برہم کر دیتا ہے۔ اگر اسکو کوئی ایسی عورت میسر آجائے جو ان تمام صفات سے متصف ہو تو وہ اسکو بیوی بنانے پر نہایت خوشی سے راضی ہو جائیگا اور سو تاویلیں اسکے حُسن و اخلاق کی کریگا۔ لیکن جب تک اسکی دسترس سے دُور ہے وہ سو نقائص اسمیں پیدا کریگا اور اس تیور سے ذکر کریگا گویا عورت تو سپردگی کے لئے ہر وقت تیار رہے مگر اسی کا بلند آلہانہ اخلاق اسکو گوارا نہیں کرتا۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس فریب میں زیادہ تر مسلمان مبتلا ہیں اور وہی ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو بے پردہ دیکھ کر سب سے زیادہ بدگمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسکا سبب بھی کم نصیبی و جذبۂ نارسائی ہے کہ یہ چیز ان کو اپنی سوسائٹی میں ملتی نہیں اور اس لئے انگوروں کو کھٹا کہہ کر وہ اپنی تسکین کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس نمائشِ اخلاق کی عمر بھی زیادہ نہیں اور وہ وقت قریب ہے جب مسلمان عورت بھی اسی طرح اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی ہر جگہ نظر آئیگی۔ اور مسلمانوں کا معیار اخلاق بھی اُس کے پاؤں میں گھونگھرو بندھوائے بغیر نہیں رہیگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس وقت مسلمان عورتیں اس دَور سے گذر رہی ہونگی ہندو عورتیں اس منزل کو طے کر کے تمدّن و عمرانیت کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہونگی اور ملکی و قومی زندگی کی اُن حقیقتوں سے گذر رہی ہونگی جن کا احساس اس وقت مسلمان مردوں کو بھی نہیں، عورتوں کا کیا ذکر ہے۔

نگار جنوری ۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں

ہندی شاعری کا پہلا دَور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چند بردائی اور اسکے ہمعصر شعراء۔ جگ نائک سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونۂ کلام۔ اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دَور (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعراء۔ متقلدین رامانند۔ بھاؤ نند، رے داس بھگت کبیر، گورو نانک دیو، میراں بائی، ملک محمد جائسی، تلسی داس، سور داس، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دَور (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیشو داس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیشو داس کے ہمعصر سندر داس، سینا پت۔ بابا دین دیال گر، بھوشن، متی رام، چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی رائے، اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعراء۔ اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء۔ ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم (۱۸۵۷ء کے بعد) للو لال، سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار بھارتیندو بابو ہریشچندر۔ پدماکر۔ بینی پربین۔ سری دھر پاٹھک کی شاعری۔ شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر۔ اُردو شاعری پر ہندی کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے۔ اور اُردو رسم الخط میں بھی۔

ضخامت کا اندازہ ۳۰۰ صفحات کیا گیا ہے۔ صرف اس ایک پرچہ کی قیمت عہ ہوگی لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائیگی۔

(مینیجر نگار)

عربوں کا شوق سیاحت

اور

اُن کی تحقیقات جغرافی

صدر اسلام میں عربوں نے جب علم وفن کی طرف توجہ کی۔ تو دُنیا میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ بازار علم کی متاع گراں ارزکے یہی تنہا خریدار تھے۔ اور حکمت وفلسفہ کی دُنیا ان کے وجود پر نازاں تھی۔ عرب لوگ جس وقت علم وحکمت کی غیر فانی دُنیا پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس وقت یورپین قومیں جہالت ونادانی کے تاریک بیابانوں میں سرگرداں تھیں۔ عربوں نے جن علوم کی طرف توجہ کی ان کے تمام نشیب وفراز پر پورا عبور حاصل کیا۔ اور مختلف علوم وفنون میں ایسی جامع کتابیں لکھیں جو عربوں کی ذہنی برتری کی آئینہ دار تھیں۔

جس شخص نے تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ تسخیر ممالک کے بعد عربوں میں خدمتِ علم کی تحریک دفعتہً ایک حیرت انگیز سرعت کیساتھ پیدا ہوئی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں عالمِ اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

اسلام کا آفتاب ساتویں صدی کی ابتداء میں افق عالم پر جلوہ گر ہوا۔ اور ابھی آٹھویں صدی کا چاند نہیں نکلا تھا کہ اُن کی حکومت ایک مستقل وپائیدار حکومت ہوگئی۔ ۶۳۲ء سے لیکر ۶۳۸ء تک عربوں نے شامی بلاد فتح کر لئے۔ اور ۶۳۲ء سے لیکر ۶۴۲ء تک فرات۔ سندھ اور جیحوں کے درمیانی علاقے اسلامی حکومت میں شامل ہوگئے۔ ۶۳۸ء میں مصر۔ ۶۴۲ء میں قیروان ۶۴۹ء میں جزیرہ قبرص اور روڈس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ اور ۷۰۱ء میں بلاد ماوراء النہر۔ ۷۱۱ء سے لیکر ۷۱۳ء تک بلاد اندلس عربوں کے زیرنگیں ہوئے غرض یہ کہ آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں خلفاء اسلام کی حکومت کا دائرہ ہندوستان سے لیکر اوقیانوس اٹلنٹک تک اور جبال قاف سے لیکر صحرائے افریقہ تک پھیل گیا۔

بلاد وممالک کی تحقیق ومعرفت میں عربوں نے بھی اپنی فتوحات سے وہی کام لیا جو رومانیوں نے لیا تھا جس سرزمین پر قدم رکھا اس کے تمام حالات کو تفصیل سے معلوم کیا۔ اور جس شہر کی تسخیر کی اس کی تمام خصوصیات کو دریافت کیا۔ دوسری قوموں کے اختلاط کیوجہ سے عربوں کے دل میں علوم کے اکتساب کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اس جذبہ کی تکمیل میں ہر امکانی کوششوں سے کام لینا شروع کیا۔ چنانچہ وہ لوگ اپنی فطری ذہانت سے بہت جلد ان علوم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عربوں نے پہلے پہل یونانی لٹریچر کے ابتدائی سرمایہ کو سریوں سے حاصل کیا۔ اور سریوں نے اُن نسطوریوں سے اسکی تحصیل کی تھی جو شاہان روم کے ظلم سے

گھبرا کر فارس کی طرف بھاگ گئے تھے۔ یہ لوگ علوم و فنون میں عموماً اور طب میں خصوصاً بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے مدینۃ الرہا میں ایک مدرسہ بھی قایم کیا تھا۔ جس کو زینون ایزوری نے اسی زمانہ میں برباد کر ڈالا۔ لیکن پھر انہوں نے جندیسا پور (خوزستان) میں اس مدرسہ کی دوسری یادگار قایم کی جو عرصہ دراز تک طالبانِ فن اور اربابِ علم و دانش کا مرجع عام رہی۔

عربوں نے جب حکماء یونان کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا تو اُن کی طبیعتوں میں ان تصانیف سے ایک خاص شیفتگی پیدا ہوگئی۔ اور وہ ان تصانیف کے بڑے دلدادہ بن گئے۔ اس تحریک کے اسباب خلیفہ ابوجعفر المنصور العباسی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور خلافتِ عباسیہ کے فرمانرواؤں میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے علم و فن کی طرف توجہ کی۔ خلیفہ ابوجعفر نے ملوک روم کے پاس متعدد وفود بھیجکر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں۔ اور ماہر فن مترجمین سے اُن کے ترجمے کرائے۔ دار الخلافتہ میں ارباب علم و فن کی ایک جماعت بھی جو فلسفہ اور علوم میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اور خلیفہ منصور چاند کی طرح اسی جماعت کے ہالے میں رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی علماء فن کی بہت سی جماعتیں تھیں۔ جو عصر خلافت کی رونق کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

اس باب میں تفصیل سے گفتگو کرنی چونکہ ہمارے اس مقالہ کے حدود سے خارج ہے۔ اس لئے ہم اس دلچسپ بحث کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے یہاں جغرافیہ کی کیا حیثیت تھی؟ اور وہ کیا اسباب تھے جو اس فن کی ترقی کا سبب ہوئے؟

پہلا سبب خلفاء راشدین کی وسعت فتوحات تھی۔ زمانہ خلافت میں جو ملک فتح کئے جاتے تھے ان کی دو صورتیں ہوتی تھیں صلح و امان یا جنگ و قوت۔ اور شریعت اسلامیہ میں ہر دو قسم کے مفتوحات کے لئے جداگانہ احکام ہیں۔ اس لئے ملکوں کا جغرافیائی علم ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ ہر مفتوح ملک اور ہر مسخر قبیلہ کے حالات کو جاننے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ پھر چونکہ ان کی حکومت کا دائرہ بڑی حد تک وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ جغرافیائی حیثیت سے ان تمام شہروں کے احوال سے بھی واقف ہوتے گئے۔

دوسرا سبب عربوں کے تجارتی سلسلہ کا غیر معمولی پھیلاؤ تھا۔ عربوں کی تجارت کا دائرہ خود ان کی فتوحات سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ ان کی تجارت مشرق و مغرب۔ شمال و جنوب تقریباً دنیا کے ہر ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ فینیشیوں کے زمانہ سے لیکر بطالسہ اور رومان کے عہد حکومت تک یہ لوگ بحر متوسط اور بلاد ہندوستان کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ اگر عربوں کے اس سلسلہ کو اور وسعت نظر کے ساتھ تاریخ میں ڈھونڈیئے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود فینیشی (فینیقی) قوم جو اپنے عہد حکومت میں دریاؤں کی مالک تھی۔ اصل میں شجرۂ عربیہ کی ایک شاخ ہے۔ اس لئے یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی تجار عرب اسباب تجارت کی تلاش میں مشغول تھے۔ اور ایشیا و شمالی افریقہ کے سواد اعظم کے ساتھ بھی ان کا تعلق اسی بناء پر تھا۔ عربوں میں چونکہ قدرت نے تجارت کا ایک طبعی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس باب میں وہ درجہ حاصل کیا جو قدیم قوموں کو اُس وقت تک حاصل نہ ہو سکا تھا۔ حتیٰ کہ انکشاف امریکہ سے پہلے متاخرین کی بھی کسی جماعت کو وہاں تک رسائی نہیں حاصل ہوئی۔ تجار عرب دنیا کے گوشہ گوشہ میں مصروف تجارت تھے۔ اور ان کے قافلے دنیا کے چپے چپے میں تجارتی سامان کی خرید و فروخت کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ عربوں کے تجارتی راستے چار تھے۔

پہلا راستہ اندلس۔ یورپ۔ اور بلاد صقالبہ (روس) سے ہوتا ہوا بحر خضر۔ بلخ۔ اور بلاد تغزغز کو جاتا تھا۔ دوسرا شمالی افریقہ۔ مصر۔ شام۔ کوفہ۔ بغداد۔ بصرہ۔ اہواز۔ فارس۔ کرمان۔ سندھ۔ اور ہندوستان کا راستہ تھا۔ باقی دو راستے بحر روم کو عبور کرتے ہوئے ایک سوریہ اور خلیج عجمی کو جاتا تھا۔ اور دوسرا اسکندریہ اور بحر احمر سے ہوتا ہوا بحر ہند میں مل جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عرب کی تجارت کا سلسلہ مشرق میں جزائر ایشیا سے لیکر چین تک اور شمال میں اواسط ایشیا اور بلاد صقالبہ (روس) سے لے کر بحیرہ بالٹک کے ساحلوں تک اور جنوب میں مشرقی افریقہ کے ساحل سے مڈگاسکر تک اور مغرب میں سوڈان سے لیکر بحر اٹلانٹک کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔

منجملہ دیگر اسباب کے ایک بڑا سبب فریضۂ حج بھی تھا۔ اطرافِ عالم سے کعبہ کا قصد کرتے تھے (جیسا کہ اس وقت بھی یہ طریقہ جاری ہے) اور بغداد۔ قاہرہ اور دمشق میں سب لوگ جمع ہوتے تھے۔ پھر یہیں سے اقطار حجازیہ کے ارادہ پر سفر کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مختلف بلدان و ممالک کے متعلق خود اپنے مشاہدات اور غیروں کے سنے ہوئے واقعات کو مدون کیا۔ متقدمین اسلام نے مقامات کی تحقیق میں جو کتابیں تصنیف کیں وہ دو قسم کی تھیں۔ بعض کا منشاء صرف مشہور شہروں کا حال بیان کرنا تھا۔ اور بعض کا مقصود صرف ان مقامات کا بیان تھا جو عربوں کی روایات اور اشعار میں اکثر ملتے ہیں۔ جن مصنفین نے شہروں کی طرف توجہ کی وہ تقریباً اس میدان میں متقدمین حکماء یونان کے نقش قدم پر چلے۔ اور راستوں کی مسافت کو بھی متعین کیا۔ اس زمرہ میں ابن خردادبہ۔ احمد بن واضح۔ جیہانی۔ ابن الفقیہ۔ ابوزید البلخی۔ ابواسحٰق الاصطخری۔ ابن حوقل۔ ابوعبداللہ البشاری۔ حسن بن محمد المہلبی۔ ابن ابی عون البغدادی۔ ابوعبید البکری۔ قزوینی۔ یاقوت حموی۔ شمس الدین مقدسی۔ ابوالحسن علی الہروی۔ شریف ادریسی۔ ابوالفداء۔ ابوالعباس احمد السرخسی۔ علی بن حسین المسعودی۔ مراکشی۔ عبدالرشید الباکوری۔ ابوالقاسم شیرازی۔ شیخ ازری الاسفرائینی۔ شیخ تقی الدین المقریزی۔ خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنی تصنیفات میں صرف اماکنِ عربیہ اور منازلِ بدویہ کے بیان پر اکتفا کی ہے۔ اُن میں ابوسعید سیرافی۔ ابومحمد الاسود غندجانی۔ ابوزیاد کلابی۔ محمد بن ادریس بن ابی حفصہ۔ ہشام بن محمد الکلبی۔ ابوالقاسم زمخشری۔ ابوالحسن عمرانی۔ ابوعبید البکری الاندلسی۔ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی۔ ابوالفتح نصر بن عبدالرحمان الاسکندری۔ برہان الدین۔ ابراہیم البقاعی۔ ابوالفتح محمد الہمدانی۔ ابن الجوزانی۔ علی بن محمد الخوارزمی۔ محمد بن ایاس الحنفی۔ ابوالمجد اسمٰعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی۔ ابوالفضل البقالی الخوارزمی۔ ابوبکر محمد الکندی۔ ابوعبداللہ محمد القضاعی۔ ظاہری۔ ابوالحسن احمد الاشعری۔ ابوسعید اصمعی۔ ابوعبید السکونی۔ حسن بن احمد الہمدانی۔ ابوالاشعث الکندی کا ذکر ضروری ہے۔

مسلمانوں میں ان کے سوا ایک دوسری سیاح جماعت بھی تھی۔ جس نے اپنی سیاحتوں کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ ان میں ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح کا نام خصوصیت کیساتھ قابلِ ذکر ہے۔ انہی سیاحوں میں بعض اہلِ ادب نے جغرافیۂ طبعی میں بہت زیادہ تحقیق سے کام لیا۔ اسلامی شہروں کے علاوہ دوسرے ممالک کے حالات و واقعات بھی سپرد قلم کئے۔ لیکن غیر اسلامی ممالک کے متعلق ان لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ان کا بیشتر حصہ اگرچہ غیر محقق تھا لیکن پھر بھی ان کی محنت کی داد دینا پڑتی ہے

کیونکہ وہ لوگ ان قوموں کی زبانوں سے ناواقف تھے۔ اور ان قوموں کیساتھ چند ناگزیر اسباب کی بنا پر ان لوگوں کا اختلاط بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ابو الفداء نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے :-

"میں نے اس مختصر کتاب میں فن کی وہ تمام معلومات یکجا کر دی ہیں جو کتابوں میں متفرق طور سے موجود تھیں۔ اس فن میں اب تک جتنی کتابیں تالیف کی گئیں وہ اصل مقصود پر بہت کم حاوی ہیں۔ اقلیم چین جو اپنی عظمت اور کثرت آبادی میں شہرۂ آفاق ہے اُس کی خبریں ہم کو بہت کم معلوم ہیں۔ اور جو کچھ معلوم ہیں وہ بھی غیر محقق ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے متعلق بھی جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ تشنۂ تحقیق ہیں۔ بلاد بلغار۔ بلاد جرکس۔ بلاد روس۔ بلاد سرب۔ بلاد اولق (فلاخ)۔ بلاد فرنگ خلیج قسطنطنیہ سے لیکر بحر محیط غربی تک بہت سے بڑے بڑے شہر ہیں۔ لیکن بعض شہروں کے علاوہ اور ممالک کے اسماء تک سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی طرح سوڈان کے جنوبی علاقہ میں بھی بہت سے بلاد ہیں۔ جو حبش۔ زنگ۔ نوبہ۔ تجرور۔ زیلع وغیرہ سے بالکل مختلف اور جدا ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی معلومات فن کا خزانہ یکسر خالی ہے۔ مصنفین اسلام نے کتب مسالک الممالک کا بیشتر حصہ صرف اسلامی ممالک کی تحقیقات میں صرف کر دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی۔ الخ"

غرض یہ کہ مسلمانوں نے ابتداء میں اس فن کی جو خدمات انجام دیں وہ اگرچہ غلطیوں سے پاک نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مسلسل کوششوں نے ان کو آگے چلکر اس میدان میں بہت کامیاب ثابت کیا۔

(۲)

آٹھویں صدی میں جغرافیہ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں۔ وہ عبارت ہیں ان رسائل سے جن کی تصنیف کا منشاء صرف بدوی قبائل کی نفع رسانی تھی۔ چنانچہ یہ تمام کتابیں محض پہاڑوں۔ وادیوں۔ صحراؤں اور منزلوں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ ازانجملہ ایک کتاب النضر البصری مشہور تصنیف ہے۔ جس کو مصنف نے آٹھویں صدی کے اواخر میں خراسان میں بیٹھ کر تصنیف کیا تھا۔ اسکا مصنف ۱۲۲ھ میں پیدا ہوا۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس میں زیادہ تر مرد و عورت۔ جانور۔ پہاڑوں۔ چاند و سورج۔ دودھ اور شراب۔ شجر و نباتات۔ پانی اور چشمے۔ ہوا اور بدلی وغیرہ کے خواص و افعال سے بحث کی گئی ہے مصنف نے اس کی ترتیب بڑے عمدہ انداز پر کی ہے۔ اور وہ تمام باتیں تفصیل کیساتھ اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ جن کی بدوی قبائل کو اکثر ضرورت پڑا کرتی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اور بھی اس قسم کی بہت سی کتابیں ہیں۔

ممالک و بلدان کی تعریف میں سب سے پہلے جو مبسوط کتاب تالیف کی گئی وہ ابو اسحٰق اصطخری کی مشہور تصنیف ہے۔

ابو اسحٰق ان نامور علماء اسلام اور مشاہیر سیاحین میں سے ہیں، جو نویں اور دسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ جن لوگوں نے اسباب فن کی تلاش اور در علم کے جستجو میں مختلف اماکن و امصار کی سیاحت کی۔ ہر ملک کے حالات و آثار کو جمع کیا۔ اور خواص بلدان و امزجہ اقالیم کی حقیقت بھی معلوم کی۔ ان سیاحوں میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک جماعت نے تو صرف اپنے حالات سیاحت

ہی کو مدوّن کرنے پر اکتفا کی - اور دوسری جماعت نے اپنے سفرناموں میں مشاہدات کے علاوہ تاریخی - جغرافیائی اور ادبی تصنیفات کے معلومات کو بھی حکماء یونان کے دستور کے موافق بیان کیا - ان لوگوں کے پاس چونکہ علوم و فنون کی تحصیل کے ذرائع کثیر نہ تھے - اس لئے وہ لوگ اس کے لئے سفر پر مجبور ہوتے تھے - اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے نامور مؤرخین مثلاً ہیرودوٹس اور پولینیوس یا مسلمانوں میں مسعودی و ابن حوقل وغیرہ بہت بڑے سیاح بھی تھے -

ابو اسحٰق

ابو اسحٰق اصطخری دسویں صدی کے نصف اوّل میں مدینۂ اصطخر میں پیدا ہوا - جو فارس کا ایک مشہور شہر ہے - علم کی تلاش میں اس نے بعض اسلامی شہروں کا سفر کیا - اور جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی - جس میں مختلف دیار و امصار - جبال و انہار کے مواقع اور بعض بعض مسافتوں کو بیان کیا - اگرچہ مصنف خواص بلدان اور امزجۂ اقالیم کی تحقیقات بخوبی نہ کر سکا لیکن پھر بھی موصوف کی یہ کاوشیں بہت کچھ لائق تعظیم ہیں - یہ اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں - اور ان کی یہ تصنیف کتب مسالک و الممالک میں بہت مشہور ہے - ابن حوقل نے جو ان سے چند سال بعد پیدا ہوا - اپنی تصنیفات میں اس کتاب سے اکثر جگہ استشہاد کیا ہے - لیکن ابو اسحٰق نے بھی اپنی یہ کتاب ابو زید البلخی کی ایک کتاب تقویم البلدان کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھی - جس کو ابو زید نے (بہ روایت مسعودی) تقریباً ۹۲۱ء میں تصنیف کیا تھا - قدماء مصنفین کے پاس چونکہ ذرائع معلومات کی کثرت نہ تھی اس لئے بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں کا طرز نگارش یہ تھا کہ وہ لوگ ذاتی مشاہدات کے علاوہ اگلے مصنفین کی کتب تواریخ و جغرافیہ کا خلاصہ بھی اپنی تصنیفات میں درج کر دیا کرتے تھے - اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو یونان کے ماہرین جغرافیہ اور مشاہیر اہل قلم نے بھی اختیار کیا تھا - چنانچہ بطلیموس کی عظیم الشان جغرافیائی تصنیف حقیقت میں مارنیوس کے جغرافیہ کی دوسری نقل ہے - جس کو بطلیموس نے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے -

نویں صدی کے اندر علم الجغرافیہ میں جتنی کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں ایک مشہور کتاب المسالک والممالک مصنفہ ابو العباس احمد بن محمد الطیب السرخسی (المتوفی ۸۹۹ء) بھی ہے - اس کمیاب تصنیف کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے اپنی بعض کتابوں میں کیا ہے - اس کے علاوہ اس فن میں عبید اللہ بن عبد اللہ المشہور با بن خرداذبہ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں کی بھی ایک تصنیف ہے - جو علامہ شریف ادریسی کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق سے بہت مشابہ ہے - لیکن اس سے زیادہ مختصر ہے - مصنف نے اس کتاب میں مختلف مقامات کی مسافتوں کو بیان کیا ہے راستوں کی تعیین کی ہے - اور بعض دوسرے جغرافیائی حقائق پر بھی روشنی ڈالی ہے - فرانسیسی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ پیرس میں ۱۸۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے -

مسعودی

بغداد میں نویں صدی میں پیدا ہوا - مسعودی بچپن ہی سے طلب علم اور سیر و سیاحت کا بڑا شائق تھا - عنفوان شباب ہی میں وہ تمام ممالک اسلامیہ اور قرب و جوار کے ممالک کا سفر کر چکا تھا - مسعودی علم و فن کا بڑا حریص تھا - اس نے بہت سے علوم کی تحصیل کی - لیکن حکمت و ادب - تاریخ و جغرافیہ اس کے ذوق کی خاص چیزیں تھیں - ۹۱۵ء میں اصطخر آیا - اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا - پھر ہندوستان کا سفر کیا - بعد یہاں کے بعض حصوں کی جغرافیائی تحقیقات کی - (دوسری مرتبہ اور اس سے چار برس پہلے بھی وہ ہندوستان آ چکا تھا) اس کے بعد بحر جنوبی سے ہوتا ہوا مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر اترا - اور کچھ دنوں کے بعد پھر دریا کو عبور

کر کے جزیرہ عرب میں آیا۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ہے۔ جو ان سیاحوں کی واقعی تاریخ بتا سکے۔ اس کی تصنیفات سے البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً ۹۴۰ء میں سیر و سیاحت کو ختم کر کے باقی عمر ان تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ مسعودی نے ۳۴۶ھ مطابق ۹۵۷ء میں بمقام فسطاط وفات پائی۔

مسعودی نے ایک کتاب اخبار الزمان ومن اباده الحدثان تاریخ میں لکھی۔ جو فن کی عظیم الشان تصنیف ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں پہلے ہیئتِ ارض۔ دیار و امصار۔ جبال و انہار۔ معادن و منابع کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر تمدن و عمران۔ اخبار و حوادث۔ اصل نسل۔ انقسام اقلیم۔ اور طبائع انسانی کے اختلافات وغیرہ جیسے اہم مسائل کو حوالہ قلم کیا ہے۔ اس کے بعد قرون ماضی کے گذشتہ اقوام و امم۔ ملوک و سلاطین۔ انبیاء اور اولیاء کے واقعات درج کئے ہیں۔ پھر ہر سن کے تحت میں مختلف واقعات اور متفرق حوادث کو زمانۂ تالیف مروج الذہب یعنی ۳۳۵ھ مطابق ۹۴۶ء تک تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنے مطالب گوناگوں کی وجہ سے بہت زیادہ ضخیم ہوگئی۔ اس لئے مصنف نے پھر ایک دوسری تصنیف کتاب الاوسط کے نام سے مرتب کی۔ جس میں اخبار الزماں کی تفصیلات کو اجمال کیساتھ بیان کیا گیا۔ لیکن اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل تھی کہ کتاب کی ضخامت کچھ زیادہ کم نہ ہو سکی۔ اس لئے مصنف نے اسی اوسط کا بھی ایک معقول اختصار مروج الذہب معادن الجوہر کے نام سے تالیف کیا۔ مسعودی کی کتاب اخبار الزمان تیس فن پر مشتمل ہے۔ اور یہ تصنیف بہت ہی نادر و کمیاب ہے۔ اور کتاب الاوسط بھی جو اخبار الزماں کیساتھ بیس جلدوں سے زیادہ میں شائع ہوئی تھی اس وقت بالکل ناپید ہے۔ مروج الذہب کے مقدمہ میں (جو اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے) مصنف لکھتا ہے کہ:-

"میں اس کتاب میں ان تمام باتوں کو مجمل طور سے بیان کروں گا جن کو اخبار الزماں میں بسط و تفصیل کیساتھ لکھ چکا ہوں اور ان باتوں کو بھی اختصار کیساتھ عرض کروں گا جو کتاب الاوسط میں آ چکی ہیں۔ غرضکہ یہ کتاب اخبار الزماں اور کتاب الاوسط دونوں کے مطالب کا خلاصہ ہو گی۔"

مروج الذہب فن کی موجودہ عربی تصنیفات میں مشہور چیز ہے۔

ابن حوقل

ابو محمد بن علی الموصلی نام اور ابن حوقل کنیت ہے۔ دسویں صدی کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا۔ اور یہیں نشو و نما پائی۔ جس وقت مسعودی گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ اس وقت ابن حوقل بلادِ اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف تھا۔ اور ۲۸ برس تک مسلسل (۹۴۲ء سے لیکر ۹۷۰ء تک) سفر کرتا رہا۔ سفر سے لوٹنے کے بعد ۹۷۶ء میں اس نے اپنے مشاہدات کو کتاب المسالک والممالک میں مدون کیا۔ اس کتاب میں زیادہ تر ممالک اسلامیہ ہی کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور غیر اسلامی شہروں کے متعلق بہت کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ابو الفدا نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس کتاب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:-

"ابن حوقل کی یہ کتاب بہت ہی مطول ہے۔ مصنف نے ممالک کا حال نہایت ہی استقصاء کیساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن طول و عرض اور اسماء مقامات وغیرہ کی تفصیل نظر انداز کر دی ہے۔ اس وجہ سے کتاب کا بیشتر حصہ ناقص اور مجہول الاسم رہ گیا ہے۔"

ابن حوقل نے اس کتاب میں ثروتِ بلاد۔ تجارتِ ملک۔ (ٹیکس اور محصول) پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور راستوں کی مسافت کو

بھی خاص طور سے بیان کیا ہے - علماء یورپ نے ۱۸۷۳ء میں اس مفید تصنیف کو لیدن میں شائع کیا - اور ۱۸۷۰ء میں یہیں پر ابو اسحق اصطخری کی مشہور تصنیف بھی شائع ہوگئی - اور لیدن ہی کے کسی مشہور اہلِ قلم نے ان دونوں کتابوں کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی لکھا۔

دسویں صدی کی جغرافی تصنیفات میں ابو محمد حسین بن احمد الہمدانی النحوی المتوفی ۹۳۵ء کی ایک کتاب الممالک والمسالک ہے اس کتاب میں مصنف نے یمن اور جزیرہ عرب کا حال پوری تحقیقات کیساتھ لکھا ہے - شیخ شمس الدین ابی عبداللہ - محمد بن احمد المقدسی الحنفی المعروف با بن البناء کی مشہور تصنیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم فن کی ایک جلیل القدر کتاب ہے - اس میں مصنف نے بلاد و ممالک - بر و بحر - جبل و انہار - طرق و مسالک - معادن و منابع کو بڑی خوبی کیساتھ بیان کیا ہے - مصنف اس کتاب کے متعلق خود لکھتا ہے کہ :-

"اگر اس کتاب کا دیکھنا مسافروں کے لئے ضروری ہے - تو علماء و رؤسا بھی اس سے مستغنی نہیں ہیں"

مصنف نے پہلے جہانتک ہوسکا اقالیم کی خود سیاحت کی - اور مختلف مسافتوں کو فرسخوں سے متعین کیا - اور جن چیزوں کا خود مشاہدہ نہیں کرسکا اُن کے متعلق معتبر لوگوں سے تحقیقات کی - ان سب کے بعد ۹۸۵ء میں ابن حوقل کے دس سال بعد اپنی یہ بینظیر کتاب تصنیف کی - ابو عمر محمد بن یوسف الکندی المتوفی ۹۶۱ء کی بھی ایک کتاب "خطط مصر" بھی اسی زمانہ کی ہے۔

عہد مسعودی میں بلاد اتل کے کسی امیر نے خلیفہ المقتدر باللہ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ میرے پاس کچھ ایسے لوگ بھیجیں جو باہمیت اسلام نماز روزہ کی تعلیم دے سکیں" خلیفہ المقتدر نے علماء اسلام کی ایک جماعت اس امیر کے یہاں بھیجی - جن میں احمد بن فضلان مولیٰ - محمد بن سلیمان رئیس وفد کی حیثیت سے تھے - ابن فضلان نے اس سفر کا ایک مجموعہ مرتب کیا - اور اس میں وہ تمام واقعات تفصیل سے بیان کئے جو روانگی بغداد سے واپسی تک مشاہدہ میں آئے تھے - اور یہ سفر ۱۱ صفر ۳۰۹ھ (۹۲۱ء) کو ہوا تھا - ابن فضلان کا یہ رسالہ نادر الوجود ہے - بعض مصنفین کی تصنیفات میں اس کے کچھ کچھ احوال و واقعات ملتے ہیں - جو سر تا پا بلاد صقالبہ اور روسی اقوام کے احوال و عادات پر مشتمل ہیں - اسی قسم کا ایک دوسرا رسالہ اور ہے جس کو قسطنطین برفیرو جینی نے بلدان شمالیہ کے متعلق اسی زمانہ میں تصنیف کیا تھا - اور ابن فضلان سے ۶۰ برس پہلے ابن خرداذبہ نے بھی بلاد صقالبہ کا سفر کیا تھا - اور یہ پہلا سیاح ہے جس نے سب سے پہلے شمالی روس کی سیاحت کی - اور بحر ابیض کے کناروں پر رہنے والی قوموں کے حالات و واقعات کی کامیاب تحقیقات کی -

(۳)

ان کے علاوہ مسلمانوں میں بہت سے ایسے بحری سیاح بھی پیدا ہوئے - ان سیاحوں میں بروایت مسعودی سب سے زیادہ مشہور بلکہ بلحاظ زمانہ سب سے پہلے سلیمان نامی ایک تاجر گذرا ہے - جو نویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا - یہ شخص بحر فارس کے کنارے بندر سیراف میں رہتا تھا - سیراف اس زمانہ میں فارس کی ایک بہت بڑی اور مشہور بندرگاہ تھی - فارس اور مشرق اقصیٰ کی تجارت کا دائرہ چونکہ اس عہد میں بہت زیادہ وسیع ہوگیا تھا - اس لئے تمام اطراف عالم سے حتیٰ کہ چین اور ملایا سے بھی تجارتی جہازات اسی بندرگاہ کا رُخ کرتے تھے - سلیمان ایک تاجر تھا - اس لئے اسباب تجارت کی تلاش میں اُس نے سفر کرنا شروع کیا - اور اسی سلسلہ میں بحر ہند کو عبور کرکے

سیلون و ملاکا سے ہوتا ہوا چین پہنچا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد وطن لوٹ آیا۔ سلیمان کے اس قیمتی سفرنامہ کو ابوزید بلخی نے ۳۰۰ھ کے قریب اور مفید معلومات کا اضافہ کر کے مرتب کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو چکا ہے۔ اور یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں پیرس میں شائع بھی ہو گئی ہے۔ چینی بلاد کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مفید کتاب ہے۔ علامہ رینوڈ نے ۱۸۴۵ء میں دوبارہ اس کا ترجمہ مع اصل عربی کے شائع کیا تھا۔ ابوزید احمد بن سہیل البلخی المتوفی ۳۲۲ھ کی ایک کتاب صور الاقالیم بھی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب المسالک والممالک اور کتاب البدء والتاریخ بھی انہی کی تصانیف عالیہ ہیں۔ جو فن کی بے نظیر کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

بیرونی

بارھویں صدی عیسوی میں بھی بعض ایسے سیاح پیدا ہوئے جنہوں نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر علامہ بیرونی کی ذات گرامی ہے۔ شیخ العلامہ ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی الخوارزمی المتوفی ۴۳۰ھ ہیئت و نجوم۔ تاریخ و جغرافیہ کے بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ ہیئت و نجوم میں "قانون مسعودی" اور تاریخ میں "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" آپکی مشہور تصنیفات ہیں۔ موخر الذکر تصنیف معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس میں مصنف نے مختلف جماعتوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور فن تاریخ کے اختلاف اور مبادی و اصول کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بیرونی ریاضیات اور علم ہیئت کا امام مانا جاتا ہے۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے سندھ اور شمالی ہندوستان کے شہروں کی تحقیقات کر کے ان کے نقشوں کی غلطیاں درست کیں۔ خصوصاً بلدان اسلامیہ کی تحقیقات غیر معمولی اعتنا کے ساتھ کی۔ بیرونی گیارہ برس تک (۱۰۰۰ء سے لیکر ۱۰۱۱ء تک) سلطان محمود غزنوی کے ساتھ لڑائیوں کے سلسلہ میں یہاں پڑا رہا۔ ہندوؤں کی بعض سنسکرت تصنیفات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ بیرونی درحقیقت ان مجتہدین عظام میں سے ہے جنہوں نے علوم و فنون کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ الآثار الباقیہ کے بعض حصے پیرس میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

شیخ ابو محمد الحسن بن احمد النسابہ نے ۳۳۴ھ میں ایک کتاب اسماء اماکن میں تصنیف کی۔ اور ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری الاندلسی المتوفی ۴۸۷ھ نے جغرافیہ میں ایک عام کتاب "المسالک والممالک" کے نام سے تصنیف کی۔ پھر ۴۶۰ھ میں بلاد مغرب اور افریقہ کے متعلق کتاب المغرب مرتب کی۔ اس میں وادی نیل سے لیکر بحر اٹلانٹک تک اور بحر متوسط سے لیکر سوڈان تک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کتاب المغرب مصنف کی پہلی کتاب المسالک والممالک سے ماخوذ ہے۔ پہلے یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں جزائر میں شائع ہوئی تھی۔ پھر پیرس میں دوبارہ فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں شائع کی گئی۔ اس کے علاوہ مصنف کی ایک اور کتاب المعجم بھی ہے جس میں عجمی اسماء اماکن کو درج کیا گیا ہے۔ یاقوت نے اس معجم کا تذکرہ کیا ہے اور یہ معجم اس وقت بھی یوروپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور یہ پہلا معجم ہے جو عربی زبان میں مرتب کیا گیا۔ لیکن مصنف نے اس میں صرف ان ہی منازل عربیہ کے بیان پر قناعت کی ہے جو عربوں کے اشعار و اخبار میں پائے جاتے ہیں۔

ابو عبداللہ محمد بن سلامۃ القضاعی المتوفی ۴۵۴ھ نے بھی ایک مشہور کتاب "خطط مصر" میں تصنیف کی جس کا نام المختار فی ذکر الخطط والآثار ہے۔ شیخ ابو القاسم محمود زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ نے بھی ایک معجم تصنیف کی۔ جو اگرچہ باعتبار حجم معجم بکری سے

زیادہ مختصر ہے۔ لیکن باعتبار صحت اس سے کہیں زیادہ مستند ہے۔ صاحب قاموس نے زمخشری کے اسی معجم سے بہت سے شہروں کے نام نقل کئے ہیں۔ اور اکثر مقامات میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔ حقیقت میں فن کی یہ ایک بہت ہی مستند کتاب ہے۔ زمخشری کے شاگرد رشید علامہ ابوالحسن العمرانی نے اس کتاب میں اپنی طرف سے بہت سے اور قیمتی اضافے کرکے اسکو زیادہ شاندار بنا دیا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں یہ مفید تصنیف پیرس میں شائع ہو چکی ہے۔ اور لاطینی زبان میں اسکا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ابوالفتح نصر بن عبدالرحمن الاسکندری المتوفی ۱۱۴۶ء کی ایک کتاب "اسماء البلدان" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور بھی تصنیف ہے۔ جس میں مقامات کے اختلاف کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ حافظ ابوموسیٰ محمد بن عمر الاصفہانی نے اس کتاب کا اختصار لکھا۔ یاقوت حموی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ

"میں نے اسکو ایک محققانہ تالیف پایا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی معجم میں اس کتاب سے بہت جگہ نقل کیا ہے۔"

علی بن محمد الخوارزمی المتوفی ۱۱۶۲ء کی کتاب "اشتقاق اسماء المواضع والبلدان" بھی اس فن کی عمدہ کتاب ہے۔ "منازل عرب" کے بیان میں ابوالفضل محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی ۱۱۶۶ء کی بھی ایک تصنیف ہے۔

ادریسی شریف محمد بن محمد الادریسی الصقلی کی مشہور کتاب "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" اس فن میں بے نظیر ہے۔ علامہ روجیر افرنجی حاکم صقلیہ (سسلی) کے لئے اسکو تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب سات اقلیموں پر مرتب کی گئی ہے۔ ادریسی نے اس کتاب میں بلاد و ممالک کے اوصاف و حالات کو پوری تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے۔ میل اور فرسخ کے حساب سے مسافتوں کی تعین بھی کی ہے۔ لیکن باایں ہمہ ممالک کے طول و عرض کے کوئی بحث اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اسکا اختصار بھی لکھا ہے۔ شریف ادریسی بارھویں صدی کے مشہور جغرافیہ دانوں میں ہے۔ طلب علم کے لئے پہلے قرطبہ کا سفر کیا۔ پھر وہاں سے صقلیہ (سسلی) چلا گیا۔ ادریسی چونکہ بہت بڑا فاضل اور روشن دماغ تھا۔ اس لئے فرمانروائے سسلی نے اسکو اپنی مصاحبت خاص میں لے لیا۔ اور وہ شاہی دربار میں رہنے لگا۔ اسی تعلق سے ادریسی نے اپنی مشہور تصنیف "نزہۃ المشتاق" روجر کے نام پر لکھی۔ ۱۱۵۴ء میں جب اس تصنیف سے ادریسی کو فراغت ملی تو اس نے روجر کے لئے چاندی کا ایک مسطح کرہ بنایا جس کا وزن ۸۰۰ مارک تھا۔ اور اس کرہ پر تمام اقالیم مشہورہ کا نقشہ بنایا۔ ادریسی مسلم اور فرنگی جغرافیہ دانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جبرائیل صہیونی المتوفی ۱۶۴۸ء اور خوری یوحنا حصرونی (جبل لبنان) دو مشہور فاضلوں نے اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ جو ۱۶۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۸۳۶ء میں اسکا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا وہ حصہ جو مغرب۔ سوڈان۔ مصر۔ اندلس کے حالات میں ہے علیحدہ ۱۸۶۶ء میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ لندن میں چھاپا گیا۔

ادریسی نے "نزہۃ المشتاق" میں اگلے علماء فن کی تصنیفات سے بھی بہت کچھ مدد لی ہے۔ اور ذاتی مشاہدات کے علاوہ تجار و ملاحین کے منقولات بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں مختلف مقامات کے ۶۹ نقشے ہیں۔ جن کو ادریسی نے مذکورہ بالا کرہ سے بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن میں ادریسی کی ایک کتاب "روض الانس و نزہۃ النفس" بھی ہے۔ یہ کتاب نزہۃ المشتاق سے زیادہ عام ہے۔ ابوالفداء نے اس سے بہت مدد لی ہے۔ اور اسکا نام کتاب الممالک لکھا ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نادر الوجود تصنیف کا ایک نسخہ پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔

فن کی کتابوں میں ابو المجد اسمٰعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی کی مشہور تصنیف مزیل الارتیاب عن مشتبہ الانساب بھی ایک عمدہ کتاب ہے۔ علامہ حمویدنے تقویم البلدان میں اسکا حوالہ دیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ضبط انساب پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کتاب التفضیل" بھی ہے۔ ابو الحسن علی المراکشی کی کتاب الممالک والمسالک بھی فن کی ایک اچھی کتاب ہے۔ ابن الوردی نے اسکا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمس الدین محمد الانصاری الدمشقی کی کتاب نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر اور شیخ ازری اسفرائینی کی کتاب عجائب الدنیا۔ ابن الجزاو کی کتاب عجائب البلدان۔ ابو الحسن احمد الاشعری کی کتاب اللباب الی معرفۃ الانساب۔ ابو الفتح محمد بن جعفر الصمدانی کی کتاب اسماء البلدان۔ محب الدین النجار البغدادی المتوفی ۶۴۳ھ کی کتاب عیون اخبار الدنیا۔ ابو القاسم مسلم بن محمود الشیرازی کی کتاب عجائب الاسفار وغرائب الاخبار۔ حسن بن احمد المہلبی کی کتاب المسالک والممالک المعروف بہ عزیزی جو عزیز باللہ الفاطمی فرمانروائے مصر کے نام پر تالیف کی گئی۔ اور ابو عبداللہ الجیہانی وزیر خراسان کی کتاب الممالک الباب میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابو عبداللہ فلسفہ اور نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے غریب سیاحوں کو جمع کر کے مختلف ممالک کے حالات اور پیداوار کو دریافت کیا۔ اور راہوں کی کیفیت بھی تفصیل کے ساتھ پوچھی۔ تاکہ تسخیر ممالک اور فتوح بلدان میں آسانی ہو۔ ابو عبداللہ نے دنیا کو سات حصوں پر تقسیم کیا۔ اور ہر اقلیم کا ایک کوکب مقرر کیا۔ لیکن بڑے بڑے شہروں کے علاوہ اور دیگر مقامات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف راستوں کو البتہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف احسن التقاسیم لکھتا ہے کہ:۔

"اس کتاب میں صرف بڑے بڑے شہروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور بہت سی ضروری باتیں چھوڑ دی گئی ہیں اور ان کی جگہ ایسے غیر ضروری واقعات نے لے لی ہے۔ جن کا درج کرنا مصنف کے شایان شان نہ تھا۔" الخ

فاضل خلیل بن شاہین الظاہری کی کتاب زبدۃ کشف الممالک فی بیان الطرق والمسالک فضائل مصر میں ایک عمدہ کتاب ہے۔ ابن الحورانی کی کتاب الاشارات الی اماکن الزیارات بھی خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں شروع سے آخر تک شہر دمشق کے حالات اور وہاں کی قبور صحابہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شیخ علی بن ابی بکر السائح الہروی المتوفی بحلب ۶۰۳ھ (یا ۱۲۱۴ء) کی ایک کتاب "منازل الارض ذات الطول والعرض" ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر سی کتاب "الاشارات الی معرفۃ الزیارات" بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے حلب کے مزارات و مشاہد کو بیان کیا ہے۔ پھر آگے سفر میں جتنے مقامات متبرک معلوم ہو سکے ہیں۔ ان سب کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مصنف اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے شام۔ عراق۔ خراسان۔ مغرب۔ یمن۔ جزائر وغیرہ کے شہروں میں بہت سے وہ مشہور مآثر نہیں دیکھے جن کو اصحاب تواریخ نے بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبور کے نشانات مرور زمانہ سے محو ہو گئے۔"

مصنف کی تصانیف جلیلہ کا ایک معقول حصہ بعض سفروں میں دریا برد ہو گیا۔ معلوم نہیں ان کتابوں میں کیا کیا جواہر پارے ہونگے جن سے اسلامی لٹریچر کا دامن ہمیشہ کے لئے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ مصنف چونکہ عرصہ تک اماکن مقدسہ کی زیارت

میں مختلف مقامات کا سفر کرتا رہا۔ اس لئے مشاہدات کا بیشتر حصہ خود اسے بھی یاد نہ رہا۔ چنانچہ مصنف نے دیباچہ کتاب میں اسکی معذرت پیش کی ہے۔ لیکن باینہمہ اس کتاب میں شام وروم۔ بلاد فرنگ۔ ارض مقدس۔ دیار مصر۔ مغرب۔ جزائر بحر۔ جزیرہ اطراف ہند۔ حرمین۔ یمن۔ اور بلاد عجم۔ کے مزارات و مشاہد کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ جس کو مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد درج کیا ہے۔

تیرھویں صدی میں بھی مسلمانوں کے اندر ایک جید جماعت پیدا ہوئی جس نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ جماعت سفر و سیاحت میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابن سعید المغربی الغرناطی الاندلسی جو غرناطہ میں سنہ ۱۲۱۳ء میں پیدا ہوا اور ٹیونس میں سنہ ۱۲۸۶ء کے حدود میں وفات پائی۔ اس جماعت کا سردار ہے۔ ابن سعید پہلے قاہرہ۔ حلب۔ دمشق وغیرہ ہوتا ہوا مکہ مکرمہ گیا۔ اور حج سے فارغ ہونے کے بعد جب وطن واپس آیا تو اس سفر حجاز کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "النفحۃ المسکیہ فی الرحلۃ المکیہ" ہے۔ اس کے بعد سنہ ۶۵۲ھ میں افریقہ کی سیاحت کی۔ اور سنہ ۶۶۶ھ میں ٹیونس سے مشرق کا سفر کیا۔ ابن سعید نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے دو تو مشرق و مغرب کے متعدد سفروں کا عجیب غریب مجموعہ ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "المغرب فی حلی المغرب" ہے۔ اور دوسری کا "المشرق فی حلی المشرق" ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ دوسرے اسفار کے حالات کا دلچسپ مجموعہ ایک کتاب "عدۃ المستنجز وعقلۃ المستوفز" ہے۔ لیکن ابن سعید کی تصنیفات میں بہت سی غلط اور دور از کار روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ چونکہ ابن سعید قدماء کی کتابوں سے احوال وواقعات کو بغیر کسی نقد و نظر کے صرف نقل کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے اسکی تصنیف میں ایسے اغلاط کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بلاد مغرب اور اندلس کے متعلق ابن سعید نے جو غلط روایات اپنی تالیف میں درج کر دی تھیں۔ ان کو بعد میں ابوالحسن المراکشی نے ایک دوسری کتاب میں درست کیا۔ ابوالفداء نے اپنی مشہور تصنیف "تقویم البلدان" میں ممالک کے عرض و طول کے بیان میں ابن سعید کی اسی کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس لئے وہ بھی غلطیوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے اور ان کی کتاب میں بھی یہ تمام خامیاں باقی رہ گئیں۔

یاقوت

یاقوت حموی کی مشہور تصنیف معجم البلدان فن کی اتنی مشہور کتاب ہے کہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ شیخ امام الدین شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی البغدادی یونانی مولد تھے۔ بچپن ہی میں گرفتار ہو کر بغداد کے کسی حموی تاجر کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اپنے آقا کے سایہ عاطفت میں انہوں نے نشوونما پائی۔ اور عربی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ اور بہت سے علوم کی تحصیل کی۔ جب جوان ہوئے تو مالک نے ان کو تجارت میں لگا دیا۔ اس سلسلہ میں وہ مختلف ممالک کا سفر کرنے لگے۔ جب مالک نے یاقوت کو آزاد کر دیا تو یہ اپنی ذاتی تجارت کرنے لگے۔ جس میں کتابوں کی تجارت بھی شامل تھی۔ یاقوت کو اسی تجارت نے علمی فائدہ بہت زیادہ پہنچایا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ تقریباً تمام علوم پر قادر ہو گئے۔ مزید براں معلومات سفر کا قیمتی اضافہ اور سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ یاقوت نے بلاد عرب۔ مصر۔ شام۔ جزیرہ۔ خراسان سے لیکر نہر جیحون کے کنارے تک سیاحت کی تھی۔ اور بعض روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں انہوں نے قسطنطنیہ کا بھی سفر کیا تھا۔ اور

۱۲۲۰ء کے قریب وہ خوارزم بھی آئے تھے۔ جب چنگیز خاں تاتاریوں کے ساتھ مصروف پیکار تھا۔ اس لئے وہ پھر بلاد شام کی طرف واپس چلے گئے۔ اور یہیں ۱۲۲۹ء میں انہوں نے وفات پائی۔

یاقوت کی کتاب معجم البلدان جغرافیہ کی ایک جلیل القدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔ اور اس میں تمام مقامات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بلاد و ممالک۔ پہاڑ۔ وادیاں۔ گاؤں۔ قصبات۔ دریا معبدوں وغیرہ کے مفصل تذکرے موجود ہیں۔ دُنیا کو سات اقلیم پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ملک کی آب ہوا اور دیگر خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے۔ صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت وغیرہ کے مزاروں کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان لوگوں کے مراثی بھی دواوین سے نقل کئے ہیں۔ بعض یورپین سیاحوں کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ غرض یہ کہ فن کی یہ ایک بڑی جامع تصنیف ہے۔

۶۱۵ھ مطابق ۱۲۱۸ء میں جب وہ "مرو الشاہجان" میں تھا۔ تو یہیں اس کتاب کے لکھنے کے بعض اسباب پیدا ہوئے مصنف کو اس کتاب کے ختم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں۔ ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یاقوت ۶۲۱ھ میں اس کتاب سے فارغ ہوا۔ لیکن تصحیح کے لئے دوبارہ کئی مرتبہ نظر ثانی کی۔ یورپ کے کتب خانوں میں اس کتاب کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ ایک نودہ قدیمی نسخہ ہے جس کی نقل ۶۲۵ھ میں ہوئی تھی۔ اس نسخہ کی نقل آٹھ جلدوں کے اندر ۱۸۶۶ء میں لیبیک میں شائع کی گئی۔ یاقوت کی اسی قسم کی ایک اور مختصر کتاب ہے۔ جو اسی معجم البلدان سے بہ ترتیب حروف انتخاب کر کے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی گوٹنجن میں ۱۸۴۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یاقوت اپنی معجم کا ایک بہترین اختصار "مراصد الاطلاع" کے نام سے لکھ رہے تھے لیکن ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ خود اُن کی عمر ختم ہو گئی۔ اس اختصار کو ان کے بعد صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق نے پورا کیا۔ جو یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور اچھی چیز ہے۔ شاید جرمنی میں یہ کتاب عنقریب چھپنے والی ہے۔

قزوینی زکریا بن محمد القزوینی تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۳ء میں وفات پائی۔ جغرافیہ میں ایک مشہور کتاب "آثار البلاد و اخبار العباد" کے نام سے لکھی۔ جو ایک مقدمہ اور سات اقالیم پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۷۵ء میں قزوینی نے ایک دوسری کتاب "عجائب المخلوقات" اسی فن میں تصنیف کی۔ لیکن اس کتاب میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ یہ دونوں کتابیں گوٹنجن میں ۱۸۴۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ قزوینی چونکہ تاریخ طبعی کا بڑا ماہر تھا۔ اس لئے بعض ماہرین فن اسکو بھی "مشرق کا بلینوس" کہتے ہیں۔ زین الدین عمر بن المظفر بن الوردی المتوفی ۱۳۴۸ء کی بھی ایک کتاب اس فن میں "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں اقالیم و بلدان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں بعض معادن و نباتات کے احوال سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے لیکن تعداد زلات اور کثرت اغلاط کی وجہ سے ناقابل توجہ سمجھی جاتی ہے۔ قاضی تاج الدین بن المتوج المتوفی ۱۳۲۹ء کی کتاب "الفاظ المتاثل و ایقاظ المتغفل" بلاد مصر کے بیان میں بہترین تصنیف ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے مشاہیر جغرافیہ دانوں میں ابو الفدا سب سے زیادہ نامور ہے۔ ابو القاسم محمد النویری المالکی نے

بھی جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی۔ لیکن متقدمین کی روایات کے سوا کوئی نئی بات نہیں لکھی۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان المصری المتوفی ۱۳۴۷ء (جو ذہبی کے نام سے مشہور ہیں) ایک معجم صغیر تصنیف کی۔ عبدالرشید بن صالح بن نوری المتولد ۱۳۹۷ء کی ایک مشہور کتاب "تلخیص الآثار فی عجائب الاقطار" اسی صدی کی تصنیف ہے۔

ابوالفداء

الملک المؤید عماد الدین اسمٰعیل بن علی بن ایوب بن شاذلی (حاکم حماۃ) ۱۲۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ الملک الناصر محمد بن قلاوون کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرکے خدمت سلطانی میں رہنے لگا۔ یہانتک کہ تھوڑے ہی دنوں میں خلیفہ نے اسکو "حماۃ" کا فرمانروا بنادیا۔ ابوالفداء فقہ۔ طب اور حکمت کے علاوہ علم ہیئت میں بھی بڑا ماہر تھا۔ ۱۳۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔ جغرافیہ میں اسکی مشہور کتاب تقویم البلدان ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ اور پوری کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ اس کے بعض حصے فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ابوالفداء مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے:۔

> "میں نے اس مختصر کتاب میں وہ تمام معلومات یکجا جمع کردی ہیں جو بہت سی کتابوں میں متفرق طور سے موجود تھیں۔ اور میں اپنی اس تالیف کو اسی طریقہ پر مرتب کرونگا۔ جس طریقہ پر ابن جزلہ نے اپنی مشہور طبی کتاب تقویم الابدان کو تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ اسی انداز پر میں اپنی کتاب کا نام بھی تقویم البلدان رکھتا ہوں۔ اور سب سے پہلے میں بھی اُن ہی باتوں کو بیان کرونگا جو روئے زمین کے حالات جاننے میں ضروری ہیں۔"

ابوالفداء نے اس کتاب میں مبادیات فن کے بعد پہلے ملکوں کی تقسیم کی ہے۔ پھر شہروں کے نام۔ ان کا طول و عرض۔ اور وہاں کے حالات تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ لیکن بایںہمہ یہ کتاب ان اغلاط سے پاک نہیں ہے جن کو مصنف نے قدما کی کتابوں سے بغیر کسی نقد و نظر اور بحث و تمحیص کے نقل کرلیا ہے۔ مگر پھر بھی ابوالفداء کی یہ کتاب بہت ہی قیمتی اور معلومات فن کا گرانقدر خزانہ ہے۔

ابن بطوطہ

ابن عبداللہ محمد بن ابراہیم اللواتی الطنجی المشہور بہ ابن بطوطہ مصنف "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" سیاحان اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ابن بطوطہ ۱۴۔ حزیران ۱۳۲۵ء کو اپنے وطن طنجہ سے بغرض سیاحت نکلا۔ مغرب۔ افریقہ۔ طرابلس۔ برقہ۔ مصر۔ فلسطین۔ بلاد شام اور حلب سے ہوتا ہوا دمشق آیا۔ اور یہیں سے حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوا۔ اور زیارت بیت اللہ کے بعد نجد ہوتا ہوا پھر شام لوٹ آیا۔ عجم و عراق اور مابین النہرین کے شہروں میں گھومتا ہوا بحر بربرہ کو عبور کرکے مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر پہنچا۔ پھر جزیرہ عرب کے جنوبی حصہ کی سیاحت کرتا ہوا ہرمز آیا۔ اور جزائر بحر فارس میں (جو موتیوں کی غواصی میں مشہور رہے) کچھ دنوں تک مقیم رہا۔ اور دوسری مرتبہ پھر حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد شام ہوتا ہوا اناضول آیا۔ اور یہاں سے قرم جانے کے لئے دریائی سفر شروع کیا۔ اور بلاد قبچاق (جنوبی روس) و بلغار وغیرہ کی سیاحت کی۔ بلغار اس زمانہ میں پایۂ تخت تھا۔ ابن فضلان نے اپنے سفرنامہ میں یہاں کے حالات بڑی تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ بلغار کے آثار قدیمہ ابتک نہر اسل کے کناروں پر قائم ہیں۔

ابن بطوطہ نے شمال میں معمورہ کی اس آخری حد تک سفر کیا تھا - جہاں سے "ارض ظلمات" کی سرحد شروع ہوتی ہے - بلغار اور ارض ظلمات کے درمیان ۴۰ دن کی مسافت ہے - ابن بطوطہ نے ظلمات میں بھی جانے کی کوشش کی - لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا - ابن بطوطہ خود بیان کرتا ہے کہ :-

"ظلمات کی طرف اُن چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں سفر کیا جاتا ہے جن کو بڑے بڑے کتے کھینچتے ہیں - چونکہ اس طرف برف بہت ہوتی ہے اور برف پر نہ کسی آدمی کا قدم ٹھمتا ہے اور نہ کسی چوپائے کی کھر - اس لئے گاڑیوں میں کتے جوتے جاتے ہیں - جن کے ناخن دار قدم ان کو پھسلنے نہیں دیتے - لیکن ان سواریوں میں صرف بہت ہوتا ہے - اس لئے اس خطہ میں مالداروں کے سوا کوئی اور نہیں جاسکتا"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا - اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا - پھر قفجق ہوتا ہوا بحر الخضر کے شمالی شہروں کی سیاحت کی - پھر خوارزم (خیوا) بخارا - خراسان - قندھار - وادی سندھ سے ہوتا ہوا دہلی آیا - اور دو برس تک بحیثیت قاضی دہلی میں رہا - اس کے بعد وہ چین کے ارادے سے روانہ ہوا - کنبایت - کالی کٹ - جزائر ملدیو - لنکا - سوماترا - جاوا وغیرہ کا سفر کرتا ہوا چین پہنچا اور خان بالق (پیکن) میں جو پایہ تخت سلطنت ہے کچھ دنوں مقیم رہا - پھر یہاں سے مغربی ممالک کی سیاحت کے لئے آگے بڑھا - اور تقریباً ۲۴ برس تک مسلسل گھر سے باہر رہنے کے بعد ۱۳۴۹ء کے قریب طنجہ اپنے وطن واپس آیا - لیکن کچھ دن نہ گذرے تھے کہ پھر سفر کی تیاری شروع کر دی - اور پہلے اندلس آیا اور یہاں سے غرناطہ چلا گیا - ۱۳۵۲ء میں سلطان مراکش کی طرف سے قاصد بنکر سوڈان گیا - اور سوڈان میں دریائے ٹمبکٹو کے اس پار تک کے ممالک کی سیاحت کی - پھر فاس واپس آیا - اور یہیں ۱۳۷۷ء میں اسکا انتقال ہوا -

ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ چار جلدوں میں بمقام پیرس ۱۸۵۳ء میں شایع ہوچکا ہے - بعض لوگوں نے فرانسیسی زبان میں بھی اسکا ترجمہ لکھا ہے - یہ سفرنامہ عجیب غریب معلومات فن کا ذخیرہ ہے - اگرچہ اس میں بہت سی غیر محقق اور مضطرب روایات بھی موجود ہیں - مگر باینہمہ ارباب ذوق کے لئے اس میں بہت کچھ سرمایۂ دانش و اعتبار اور مایۂ بصیرت و معلومات موجود ہے -

اس کے علاوہ اور بھی بعض علماء اعلام کے متعدد چھوٹے چھوٹے سفرنامے ہیں - جن میں سفرنامہ شیخ ابن حبیب - سفرنامہ ابن جبیر (جو جرمنی میں شائع ہوچکا ہے) سفرنامہ ابن خلدون (یہ بہت ہی نادر اور نایاب ہے) سفرنامہ ابن رشید - سفرنامہ ابن الصلاح سفرنامہ ابو القاسم التجیبی - سفرنامہ بدر الدین بن رضی الدین الغزی - سفرنامہ شیخ جلال الدین سیوطی - سفرنامہ کتانی اور سفرنامہ محمد بن رشید ملا لکی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

مقریزی

اس مقالہ میں اب تک جن ممتاز ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے - ان کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی علامہ تقی الدین المقریزی المتوفی ۱۴۴۳ء کی ہے - جغرافیہ میں آپ کی کتاب "المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط و الآثار" مشہور تصنیف ہے - برہان الدین ابراہیم البقاعی المتوفی ۱۴۸۰ء نے بھی ۸۷۷ھ میں ایک کتاب "اسفار عن اشرفۃ الاخبار" لکھی - جو فن کی بہترین تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے - محمد بن ایاس المتولد ۱۵۱۶ء کی ایک کتاب ہے جس کو مصنف نے تواریخ امم سے اخذ کیا ہے

اس کتاب کے شروع میں کسی قدر علم ہیئت کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد مصر وغیرہ کے عجائبات کی تفصیل ہے ۔ پندرھویں صدی کے آخر میں غرناطہ کے اندر حسن نامی ایک مسلمان سیاح پیدا ہوا ۔ یہ مغرب کے شمالی ممالک کی سیاحت میں مصروف تھا کہ ۱۵۱۷ء میں دو لطرانی سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا ۔ اور قیدکر کے پاپائے دہم کے پاس بھیجدیا ۔ حسن یہاں پہنچکر عیسائی ہو گیا ۔ اور رومتہ الکبریٰ (اٹلی) میں رہنے لگا ۔ حسن اٹلی لاطینی اور عربی تینوں زبانوں کا بڑا ماہر تھا ۔ اس نے عربی میں افریقہ کا ایک جغرافیہ لکھا ۔ پھر ۱۵۲۶ء میں اسی جغرافیہ کو اٹلی زبان میں منتقل کر دیا ۔ یہ کتاب معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے ۔ اس کتاب کا فرانسیسی اور لاطینی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۔ کاتب چلپی یا حاجی خلیفہ مصنف جہاں نما المتوفی ۱۶۵۷ء اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہے ۔ مصنف نے اپنی تالیف میں انگریزی کی کتابوں سے بہت زیادہ مدد لی ہے ۔ اور پرتگال و اسپین کے سیاحوں کی روایات کو زیادہ اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

بدر اصلاحی

بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

نام کتاب		اصلی قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
نگارستان	(نیاز فتحپوری)	عمہ/	۸عہ/	فراست التحریر	عہ/	۸/
جمالستان	(نیاز فتحپوری)	للعہ/	ہے/	شاعر کا انجام (نیاز فتحپوری)	۱۰/	۸/
ترغیبات جنسی	(نیاز فتحپوری)	ہے/	عمہ/	فلسفۂ مذہب ۔	عہ/	۸/
مجموعۂ استفسار و جواب	(نیاز فتحپوری)	ہے/	عمہ	لالۂ رخ ۔	عہ/	۱۲/
حکمائے قدیم کیساتھ چند گھنٹے	(نیاز فتحپوری)	عہ/	۸/	مثنوی زہر عشق معہ تصاویر و مقدمہ	۸عہ/	عہ/
مذاکرات نیاز	(نیاز فتحپوری)	۱۲/	۶/	فلسفۂ شوپنہار	۸عہ/	عہ/
جذبات بھاشا	(نیاز فتحپوری)	۱۲/	۶/	منچلے	۸/	۴ہ/
فراست الید	(نیاز فتحپوری)	عہ/	۸/	گلابی اردو	۶/	۴ہ/

(۱) محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا ۔ لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک بھی نہیں لیا جائیگا ۔

(۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہئے ۔

(۳) یہ رعایتی قیمت صرف آخر جون ۳۵ء تک ہے ۔ اسکے بعد شاید اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ نہ رہے ۔

منیجر نگار لکھنؤ

دیر و حرم کے قصّے

جہاں آرا اور چھتر سال

(مسلسل)

جو بات میں نے اس رات کو ٹھانی تھی اُسے کر گزری۔ دوسرے روز میں نے اپنے محبوب کو خط لکھ بھیجا۔ جب میرا ناظر خط کا جواب لایا تو میں نے سواری کا حکم دیا۔ دہلی کے شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر جا کر ایک قدیم مسجد ہے۔ اس کی صورت ویران قلعہ کی سی ہے۔ میں وہاں پہنچی۔ ہوا چل رہی تھی۔ آس پاس کے درختوں سے ایک عجیب قسم کی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ مسجد کے برابر سڑک پر ایک یوگی مرگ چھالا بچھائے بیٹھا تھا۔ اسکا کمنڈل اور ڈنڈا اسکے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز سے کچھ کبت پڑھ رہا تھا۔ جن کا مطلب یہ تھا "دنیا ناپائیدار ہے اے بیوقوف تو اس میں پائیداری ڈھونڈھتا ہے! یہ دار المحن ہے اور تو خوشی کا جویا!" یہ جوگی آنکھوں کا اندھا تھا۔ میں نے اسکی جھولی میں چند اشرفیاں ڈالیں۔ اور اسکی متوقع رہی کہ اسکی زبان سے میری آنیوالی زندگی کے متعلق کچھ نکلے۔ یوگی بولا: "اپنی اشرفیاں واپس لے لے میرے کس کام آئیں گی۔ تیری آتما تو سکھ دکھ دونوں سے اونچی ہے تو سکھ کے کھوج میں کیوں باولی ہوئی ہے۔" یہ کہکر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چلدیا۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہ کہہ سکی۔ پاس ہی کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر میں نے اپنے محبوب کا خط کھولا اور پڑھنے لگی۔ یہ پیام شوق اپنی شرافت اور سادگی کے لحاظ سے آپ اپنا نمونہ تھا۔ اُس نے مجھے "دیوی" کے لفظ سے خطاب کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ اگر میں سنجوگتا بھی ہوتی تو وہ قنوج پر پرتھوی راج کی طرح دھاوا مار کر مجھ کو لے آتا۔" اس نے مجھے سنجوگتا کے یہ لفظ یاد دلائے تھے کہ "ہم عورتیں جھیل کے پانی کی طرح ہیں اور تم مرداُن ہنسوں کی طرح جو جھیل کی سطح پر تیرتے ہیں۔ اگر تم کو ہمارے سینہ سے جدا کر لیا جائے تو تم کس طرح رہ سکتے ہو۔" مجھے اس پیام شوق کا ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ میں خوشی سے پھولوں نہ سماتی تھی۔ جس وقت میں نے شہر کا رخ کیا تو مجھ کو ہر چیز جادو بھری معلوم ہوتی تھی۔ شہر کا نظارہ عجیب لطف پیدا کر رہا تھا۔ انسان اور حیوان۔ چرند اور پرند سب خوش خوش نظر آتے تھے۔ بازاروں میں آدمیوں کی چہل پہل سے میلہ لگا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں چاندنی چوک سے گذر رہی تھی شاہی دربار کا وقت تھا۔ سجے سجائے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ زرق برق پوشاکیں پہنیں جوق جوق

چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے صندل۔ اور زعفران۔ مشک اور عنبر کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں۔ دوکانیں زر و جواہر سے چمک دمک رہی تھیں۔ سڑک پر عورتوں کے پازیبوں کی جھنکار۔ ان کے رنگ برنگ دوپٹے۔ سروں پر پانی کی مٹکیاں۔ اور گھونگھٹوں سے ان کی مست ناز نگاہیں عجب لطف پیدا کر رہی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں سے رنگ برنگ پتنگ اُڑائے جا رہے تھے۔ شاہجہان آباد بھی کتنا خوبصورت شہر ہے۔ میں نے سوچا کہ یہاں ایک ایسی عالیشان اور آرام دہ سرائے بنواؤں گی۔ جس کا جواب کہیں ہندوستان بھر میں نہ ہو۔ ملک کے تمام اطراف کے لوگ یہاں آئیں گے۔ قیام کرینگے اور آرام پائیں گے۔ میرا نام زندۂ جاوید رہیگا۔ اور غرباء کو تو میں مالا مال کر دونگی!"

یہ سوچتی ہوئی میں شاہی محل کے میدان کے قریب پہنچی۔ میں نے یہاں سواری کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔ یہ مقام بھی چاندنی چوک کی طرح شارع عام ہے۔ یہاں بھانت بھانت کا پنچھی بولتا ہے۔ دُنیا کی ہر قوم و ملّت کے مسافر او تاجر یہاں آکر جمع ہوتے ہیں۔ زنجبار اور شام۔ خراسان اور زابلستان۔ کابل اور ترکستان۔ مصر و روم۔ چین و عرب حتیٰ کہ انگلستان او ہالینڈ کے لوگ بھی یہاں دکھائی دیتے اور ملتے جلتے ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کی کمی نہیں۔ انگور و انار۔ سیب اور سنتروں کے انبار کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں اور ہاروں سے دوکانیں لدی ہوئی ہیں۔ طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں۔ جن کی خوشبو ہر تھکے ماندے کو للچاتی ہے۔ قریب ہی میں رمّال بیٹھے فال دیکھ رہے ہیں۔ عورتیں برقعہ پہنے آتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے اُن سے کچھ پوچھتی ہیں اُن کے ہاتھ میں دام رکھتی ہیں اور خوشی خوشی چلی جاتی ہیں۔ منصب دار۔ جاگیر دار۔ رئیس اور راجہ اپنے اپنے جلوس اور جھنڈوں کے ساتھ دیوان عام کی طرف جا رہے ہیں۔ ہاتھیوں۔ گھوڑوں کا ایک تانتا لگا ہوا ہے۔ گھنٹے اور نرسنگھے بج رہے ہیں۔ طوائفیں بھاری بھاری پشوازیں پہنے زیور سے لدی پالکی کر نشین پردوں کے اندر سے اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ میں ایک طرف علیحدہ کھڑی یہ سب تماشہ دیکھ رہی ہوں لیکن خیال اپنے محبوب ہی کا ہے۔ میں راؤ راجہ کے انتظار میں ہوں کہ وہ کب ادھر سے نکلتا ہے۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسکا رسالہ دکھائی دیا۔ سب سے آگے وہ جوان رعنا اپنے سمند پر سپاہی کی پوری شان سے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جوں ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھہر گیا۔ اور گھوڑے سے اُتر کر ایک خاص ادا کیساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنے گلے سے موتیوں کا گلوبند اُتار کر اور چند سطریں لکھ کر اپنے ناظر کے ہاتھ اسکو بھیجیں۔ اُس نے جُھک کر دوبارہ سلام کیا۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی۔ اور ایک لمحہ بعد نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس لمحہ کی یاد مدتوں دل میں گدگدی پیدا کرتی رہی۔ اور اسکی تصویر میرے دل پر نقش ہو گئی۔

اب میں ایک دن کا واقعہ سناتی ہوں کیونکہ یہ حادثہ بھی یادگار ہے۔ اس زمانہ میں گلرو بائی نامی ایک رقاصہ میری بڑی چہیتی تھی۔ وہ مجھ کو اپنے رقص و سرود سے اکثر شام کیوقت محظوظ کیا کرتی تھی۔ اُس نے ایک نیا ناچ ایجاد کیا تھا ایک روز شام کے وقت وہ مجرے کے لئے آئی۔ حسن زیبائش کا پیکر تھی۔ اسکا بناؤ سنگھار غضب کا تھا۔ اس نے ناچنا شروع کیا۔ ناچتے ناچتے وہ ایک اداکیساتھ کمرے سے نکلکر میری نظروں سے غائب ہونے لگی۔ میں بھی کیفیت وارفتگی میں اسکا

تعاقب کرنے لگی۔ ہم محل کے دالان سے گذر رہے تھے۔ دیوار کے سہارے رنگ برنگ کے کنول روشن تھے۔ کچھ کچھ ہوا چل رہی تھی۔ ایک جھونکا آیا کنول کو بھڑکایا جس سے گلرو کے دوپٹہ میں آگ لگ گئی۔ اور دم کے دم میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اور گلرو بدحواس چیختی چلاتی بھاگی۔ میں اسکو بچانے لگی تو شعلوں نے مجھے بھی گھیر لیا۔ ہم لوگ دیوان خاص کے قریب تھے۔ جہاں شہنشاہ روٴساء اور سرداروں سے مشورہ کر رہے تھے۔ اگر میں چاہتی تو چیخ پکار کر فوراً مدد حاصل کر سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ راٶ راجہ بھی دیوان خاص میں موجود ہے۔ وہ آسکتا تھا۔ اور لوگ بھی دوڑ دھوپ کر سکتے تھے۔ لیکن شرم نے اجازت نہ دی۔ اور میں ہفتوں صاحب فراش رہی۔ اسی زمانہ میں میرے راکھی بند بھائی کو اورنگ زیب کیسا تھ ایک مہم پر جانا پڑا۔ مگر جانے سے پیشتر اس نے گویا میرے گلوبند کے جواب میں ایک کنگی بھیجی۔ کنگی سنہرے کمخواب کی تھی۔ اس میں موتیوں کی گوٹ لگی تھی۔ ہیرے اور موتیوں کے نگینے حد درجہ خوبصورت تھے۔ مجھے شکریہ کا خط بھیجنا لازم تھا۔ میں نے اپنے محبوب کو لکھا کہ اگر وہ مجھے اپنی تصویر ہاتھی دانت پر نقش کرا کر بھیج سکے تو وہ مجھ کو کنگی سے بھی زیادہ عزیز ہوگی۔ خط کے بھیجنے کے بعد کچھ زمانہ انتظار میں گذرا۔ بالآخر جواب آیا۔ بیتابی سے کھولا اور پڑھا۔ پڑھتے ہی زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا سا آنے لگا۔ دل بیٹھا جاتا تھا۔ غم و غصہ طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ ضبط سے کام لیا دوبارہ نظر ڈالی۔ انداز خط سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھتے وقت ہاتھ نے لغزش کی ہے۔ لیکن تحریر بلا جھجک تھی۔ جواب مختصر تھا۔ تحریر مہذب اور دلآویز تھی لیکن ہر لفظ سے سرد مہری عیاں تھی۔ مضمون یہ تھا:-

"محاذ جنگ پر سپاہی کے فرائض منصبی دم لینے کی مہلت نہیں دیتے۔ اتنی فرصت نہیں کہ خاطر خواہ عبارت آرائی کی جاسکے۔ یہ لکھنا کافی ہوگا کہ کسی مسلمان شہزادی کی تصویر کسی مرقع میں ایک چوہان راجپوت کی شبیہ بے محل اور نازیبا سی معلوم ہوتی ہے۔ اسکا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔"

میں ان لفظوں کو بار بار دہراتی۔ ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کیا کسی نے کچھ میرے خلاف کہدیا۔ اگر کہا بھی تھا تو اس آسانی سے باور کر لینے کے کیا معنی۔ کبھی سوچتی کہ کیا وہ اورنگ زیب اور روشن آراء کا طرفدار ہوگیا۔ مگر چھتر سال ایسا تو نہ تھا۔ بوندی کا راجہ اور اپنے عہد و پیمان سے منہ موڑے۔ الغرض کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور مجھ پر خوشی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت میری یہ حالت ہو رہی تھی آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی۔ کالی کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آرہی تھیں۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک دل کو سہمائے دیتی تھی۔ آن کی آن میں موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ گویا کسی نے آسمان میں چھید کر دیا۔ قیامت کا سماں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عناصر قدرت بھی میری کیفیت مایوسی اور ہراس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ اور آسمان بھی میری آہ و زاری کا ہمنوا ہے۔ نہ صرف کئی گھنٹے بلکہ کئی دن تک میرے اوپر بُرا وقت گذرا۔ بالآخر اسی غم و غصہ کی حالت میں ایک دن گویا کسی نے کان میں کہا کہ اب کس بات کا انتظار ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا ہیں۔ دولت و ثروت کی کمی نہیں۔ جس پر نظر ڈالدیگی وہی

نازبرداری کریگا۔ خواب و خیال میں زندگی برباد کرنا کونسی عقل کی بات ہے۔ جس طرح بعض کم نصیب زندگی کے دکھ درد کے غم کو شراب کے نشہ سے غلط کرتے ہیں۔ میں نے دُلارے کی بانسری کے بولوں اور اسکی آغوش کی گرمی سے اپنے غم و ہراس کی کیفیت کو مٹانا چاہا۔ دُلارے معمولی گانے والا تھا۔ لیکن اس کی آواز میں ایک کیفیت تھی اور آنکھوں میں نشہ تھا۔ ایک دن دُلارے بڑے تزک و احتشام سے اپنا پھریرا اُڑاتا ہوا محل کی جانب آرہا تھا۔ دوسری جانب سے مہابت خاں رانا پرتاپ کا بھتیجا جس نے میواڑ سے دغا کی اور ہندو مت سے مُنہ موڑا تھا اور جس کا شمار شہنشاہ جہانگیر کے نامی سپہ سالاروں میں تھا اپنے رسالے اور نشان کیساتھ دربار جارہا تھا۔ کسی چھوٹی سی بات پر دونوں کے ساتھیوں میں تکرار ہوگئی۔ اس دن سے مہابت خاں شہزادہ دارا کا دشمن اور میرے نام سے بیزار ہوگیا۔ وہ اپنا رسالہ اور نشان چھوڑکر تن تنہا شاہی دربار میں پہنچا۔ شہنشاہ نے اس کیفیت کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ جب گوّیے تزک اور احتشام سے نکلنے لگے اور نشان پھریرے اُڑانے لگے تو امراء اور روساء کی کیا حیثیت باقی رہی؟ شہنشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ دلارے سے اسکا نشان اور رسالہ چھین لیا جائے اور آئندہ کے لئے اسکو اس حرکت سے باز رہنے کی تنبیہ کردی جائے۔

مجھے بُرا تو لگا۔ لیکن میں سمجھ گئی کہ اس میں کیا مصلحت پنہاں تھی۔ بات یہ تھی کہ دربار میں ویسے ہی اورنگ زیب کے کافی دوست اور ہمارے کافی دشمن تھے ان میں اضافہ کرنا خلاف مصلحت تھا۔ مصلحت وقت کو تو میں سمجھ گئی۔ لیکن جب میں نے اُس سین کا اندازہ کیا جو دربار میں ہوا ہوگا اور ہر فرد کی زبان پر گوّیے کے نام کیساتھ ہی ساتھ میرا نام بھی ہوگا تو میں شرم سے گڑ گئی۔ کہاں میں شہنشاہ شاہجہاں کی نور نظر۔ تاج محل کی چہیتی بیٹی۔ نورجہاں اور ممتاز محل کی طرح خود سلطنت اور حکومت کی باگیں ہاتھوں میں لینے کی دعویدار۔ اور کہاں دلارے گوّیا!

میں اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑے پڑے زار و قطار روتی اور بےچینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ میں اپنی زندگی کا ماتم کرنے لگی۔ کاش مجھ کو حسب دلخواہ محبوب اور خاوند پسند کرنیکا موقع ہوتا۔ میں بھی اپنی زندگی اور معمولی عورتوں کی طرح ٹھکانے لگا سکتی تو اس شرم و ذلت کا سامنا کرنے کی نوبت کیوں آتی۔ اسی کیفیت غم و اندوہ میں میں اپنا گریبان چاک کرتی ہوئی اٹھی۔ اور کھڑکی کے سہارے جا کھڑی ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ باغبان اپنا کام ختم کرکے اور اوزار سنبھال کر اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ اس کی بیوی کے آج بچہ ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں کُڑھنے لگی کہ دیکھو کیسی خوش نصیب ہے یہ عورت جس کا خاوند اور زندگی کا سہارا اسکے پاس ہوگا۔ ہنسی خوشی اس سے باتیں کریگا۔ اور وہ اپنے پیارے بچے کو ایک خاص انداز سے اس کی گود میں دیگی۔ وہ اس ننھی سی جان کو گود میں لیکر حیرت اور خوشی سے دیکھے گا۔ اور پھر ماں کے پہلو میں لٹا دیگا۔ وہ پہلے اپنے خاوند پر فخر و ناز سے ایک نگاہ ڈالے گی۔ اور پھر بچہ کو پیار کرنے لگے گی۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مُنہ لپیٹ کر پھر پلنگ پر پڑ گئی۔ باوجود شہزادی ہونے کے اس کیفیت عذاب میں نہ میرے پہلو میں میرا بچہ تھا کہ جسے میں پیار کرتی نہ میرا خاوند جو میرے پلنگ کے پاس بیٹھ کر مجھ کو ڈھارس دے سکتا۔

رو تے روتے بالآخر میری ...."

....

"اس نسخہ کا درمیانی حصہ محض چند اوراقِ پریشان ہیں۔ جن کے سلسلہ اور ربط کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم مؤلف نے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

....

نجابت خاں سلطنت بلخ کے نامی سرداروں میں سے تھا۔ اس زمانہ میں میرے والد ماجد شہنشاہ شاہجہاں زیادہ تر زنانخانہ میں رہا کرتے تھے۔ اور دیوانِ عام میں دربار کرنے یا امراء و رؤساء سے صلاح و مشورہ کرنے کی نوبت کم آتی تھی۔ اکثر یہ فرائض مجھ کو ہی ادا کرنے پڑتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مجھے رموزِ مملکت کے متعلق نجابت خاں سے گفت و شنید کی کئی مرتبہ نوبت آئی۔ ایک دن شاہجہاں آباد میں جامع مسجد سے نماز کے بعد واپس آئی تھی۔ میری طبیعت بہت افسردہ تھی۔ میں پلنگ پر پڑی پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ کہ دفعتاً سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ لمحہ بھر بعد میرا بھائی دارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ خوش و خرم معلوم ہوتا تھا۔ پہلی بات جو اس نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ مجھے نجابت خاں سے شادی کرنے میں کچھ انکار تو نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کہا کہ جب وہ تخت و تاج کا مالک ہوگا میری شادی میں کوئی دقت لاحق نہ ہوگی۔ بلکہ اس رشتہ کے قائم ہونے سے استحکامِ سلطنت میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ لمحہ بھر میں نجابت خاں اور دُلائے دونوں کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی۔ ایک تناور درخت کی طرح سب سے زیادہ سربرآوردہ اور علیحدہ کھڑا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا معمولی سرپتہ کی طرح ہوا میں جھونکے کھا رہا تھا چونکہ دُلائے بے بضاعت اور گمنام شخص تھا میں نے اسی لئے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن اب ان رنگ رلیوں سے طبیعت سیر ہو گئی تھی۔ میں اپنی زندگی کے لئے کچھ سہارا چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگی اور بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ الخاموشی نیم رضا سمجھ کر دارا ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ شام کو شہنشاہ سے عرض معروض کی جائیگی۔

جوں ہی شام ہوئی میں چپکے سے شاہی محل کی طرف چلی۔ میں نے برقعہ سے اپنے تئیں ڈھک لیا تھا۔ تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میں حیات بخش باغ سے گذری۔ عجب سماں تھا۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی۔ سنگ مرمر کے در و دیوار گویا شعلوں کی لو سے جھلک رہے تھے۔ چنبیلی۔ جوہی۔ بیلا سب کے سب زعفرانی لباس پہنے ہوئے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ محلات کے برج اور کنگرے اور باغ کے سبزے اور درختوں میں گویا کسی نے سنہرا پانی پھیر دیا تھا۔ اس جگمگاہٹ نے میری آنکھوں کو چوندھیا دیا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے دماغ سرشار تھا۔ لیکن مجروح دل کی ٹیسیں مجھے مضطرب کئے ہوئے تھیں۔ لیموں اور نارنگی کے درختوں کی اوٹ میں ایک پتھر کی چوکی پڑی ہوئی تھی۔ میں اس پر تھک کر بیٹھ گئی۔ میں سراپا انتظار تھی کہ میرا بھائی ادھر ہی سے گذریگا۔ اور مجھے نوشتۂ تقدیر اس کی زبانی معلوم ہو جائیگا۔ نجابت خاں سے شادی کرنے کو طبیعت قبول نہیں کرتی تھی۔ اپنی شاہانہ آزادی کا قربان کرنا اور ایسے شخص کے آگے سر جھکانا جس سے طبیعت کو اُنس نہ ہو بے معنی سی بات معلوم

ہوتی تھی - ایک دن دوران گفتگو میں نجابت خاں نے بلخ کے تخت و تاج کا ذکر کیا تھا - اس وقت اسکی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں - اس کی آواز میں مسرت اور افسردگی دونوں کے انداز موجود تھے - وہ اتنا ہی کہکر رُک گیا کہ "اگر میں بلخ کے تخت و تاج کا مالک ہو جاؤں تو پھر شہزادی ...." یہ سنتے ہی میری طبیعت میں ایک کیفیت پیدا ہوئی - اور ایک لمحہ کے لئے صرف ایک لمحہ کے لئے میری یہ خواہش ہوئی کہ میں اسکی ہو کر رہتی - لیکن وہ لمحہ گذر چکا تھا - اب وہ کیفیت باقی نہ تھی - میں کشمکش کی حالت میں تھی اور منتظر تھی کہ جو کچھ فیصلہ ہونا ہے ہو جائے - میں اسی کیفیتِ انتظار میں تھی کہ دیوان عام سے گانے بجانے کی آواز میرے کانوں میں آئی - کبھی طبیعت جوشِ مسرت سے باغ باغ ہو جاتی کبھی افسردگی چھا جاتی - ایک دُھن ایسی چھڑی کہ میرے دل پر سخت چوٹ لگی - معلوم ہوا کہ کسی نے خنجر دل کے آرپار کر دیا - مجھے یاد آیا کہ یہ وہی نغمہ تھا جو میں نے اُس شام کو سُنا تھا جب میں اپنے راکھی بند بھائی کا انتظار کر رہی تھی - لیکن آج اس راکھی کی اسکی نظروں میں کیا قدر ہے - نہ معلوم وہ کس کے بازو پر بندھی ہوگی - اس نامۂ شوق کے کیا معنی ہیں جو اُس نے جواب میں مجھے لکھا تھا اور میں نے مسجد کے کھنڈروں تلے بیٹھ کر پڑھا تھا - گو وہ یوگی مجھے خواب سے جگانا چاہتا تھا - لیکن میں اُس وقت جوشِ مسرت سے اتنی مست تھی کہ ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا تھا - مقسوم کی خبر نہ تھی - اب تو وہ اورنگ زیب کی ریشہ دوانیوں کا ہمراز ہے - اس کو خاندانِ تیمور اور آئین اکبر کا کیا غم ہے - غالباً وہ میواڑ اور راجپوتوں کے ننگ و ناموس کی بھی پروا نہیں کرتا - وہ اپنے پیمانِ وفا کو بھی بھلا چکا ہے - اب تو اسکو میری یاد بھی نہ رہی ہوگی - ایک دن اس نے مجھے سنجوگتا کہکر پکارا تھا - لیکن اب .... یہ یاد آتے ہی میرا کلیجہ شق ہونے لگا - روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں - چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا - تھوڑی دیر بعد چار و ناچار میں نے اپنے ہوش سنبھالے - اب دارا کے لوٹنے کا وقت تھا - میں اپنے نوشتۂ تقدیر سے آگاہ ہونے کے لئے بیتاب تھی - میں اس دالان کی طرف چلی جہاں سے دارا میرے محل کو جاتا - تاکہ میں اسے راستہ ہی میں ملجاؤں - جونہی میں دیوان خاص کے قریب پہنچی مجھ کو کچھ آوازیں سنائی دیں - گویا دو شخص بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں - میں فوراً ایک گوشہ میں چھپ گئی - مجھے دو شخص دکھائی دیے - ایک اُن میں سے قدآور شاندار اور سجیلا جوان تھا - سر پر سبز شملہ - بدن پر زرد رنگ کا بوٹے دار خلعت پہنے تھا - اسکو میں نے پہچان لیا یہ نجابت خاں تھا - دوسرا معمولی سا کم رُو آدمی تھا - یہ دونوں بیباکی سے قہقہے لگا رہے تھے - بعد میں یہ ایک طرف کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے - میں قریب چھپ کر سُننے لگی -

نجابت خاں:- (حقارت آمیز لہجہ میں) دارا شکوہ کے تیور تو ابھی سے ایسے ہو گئے ہیں کہ گویا وہ واقعی تخت و تاج کا مالک ہے - لیکن یاد رہے کہ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار باقی ہے اُسکا تخت پر چڑھنا دشوار ہوگا - تم نے غور کیا تھا کہ جب اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ بادشاہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کرنے کے لئے تیار نہیں تو اسکا اندازِ بیان کیسا مغرور اور حقارت آمیز تھا - اگر بادشاہ اپنی بیٹی کو اپنے ہی محل میں رکھنا چاہتا ہے تو کون مزاحم ہو سکتا ہے -

امیر:- غالباً بادشاہ بعد چندے اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگا - اسکو ذی مرتبہ اور ذی ہمت مددگاروں کی ضرورت ہے -

اورنگ زیب کی نظر تخت و تاج پر ہے۔ جو شاہجہاں جہانگیر کیساتھ کر گذرا۔ اورنگ زیب شاہجہاں کیساتھ وہی سلوک کرنے سے دریغ نہ کریگا۔ اسکو تمہاری امداد کی ضرورت ہوگی۔ جہاں آرا بیگم تو تم کہتے تھے کہ بڑی حسین اور ذی ہوش شہزادی ہے۔ اور سنا جاتا ہے کہ بڑی دولتمند بھی ہے۔ سورت اسکی ملکیت ہے۔ اور اسکی آمدنی صرف اسکے پاندان کے لئے مخصوص ہے۔

نجابت خاں:۔ (جسکا چہرہ غصہ سے سرخ تھا۔ تڑپ کر بولا) میں نے از خود جہاں آرا بیگم سے شادی کا شوق ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ تو ولیعہد نے اپنی چاپلوسی کی باتوں اور اسکی تعریف کے پل باندھ کر مجھ کو اس جال میں پھنسایا۔ اور ہاں کرالی شہزادی کے حسن کا حال تو غالباً اور لوگ زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں میں نے تو صرف پس پردہ یا نقاب دیکھا ہے۔ اُس کے ناز و نیاز کا ساز باز یا تو دلارے کو معلوم ہوگا یا راؤ راجہ کو جس کے نام کیساتھ اسکا نام منسوب کیا جاتا ہے۔ (یہ کہتے ہوئے اس نے تمسخرانہ قہقہہ لگایا اور میری یہ کیفیت کہ گویا کسی نے تیر جگر کے پار کردیا)۔ لیکن شہزادی اگر میرے محل میں آتی تو اس کو یہ سبق سیکھنا ہوگا کہ وہ میرے ننگ و ناموس کا پورا پورا پاس و لحاظ کرے۔ میں اپنے جانور کو خود ہی اچھی طرح اڑا کر ڈربے میں نکال سکتا ہوں مجھے اسکی ضرورت نہیں کہ دوسروں سے ایڑ لگواؤں۔

امیر:۔ (جو نجابت خود غرض۔ مکار، اور چاپلوس معلوم ہوتا تھا۔ بولا) میرے دوست اس قدر جوش میں نہ آؤ۔ تمہیں تو یاد ہوگا کہ شہزادی کی عصمت پروری کا تو بڑا چرچا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے آگ کے شعلوں میں جل جانا منظور کیا لیکن غیر محرم کے سامنے عریاں ہونا گوارا نہ کیا۔

نجابت خاں:۔ ہاں عورت شاندار ہے۔ وہ اپنے محبوب کا دل مسخر کرنے کے لئے جان پر کھیلنے سے بھی پرہیز نہ کریگی۔ ممکن ہے کہ اس حادثہ کی تہ میں بھی راز پنہاں ہو۔ لیکن اُس وقت اسکا محبوب کون تھا۔ کم از کم میں تو نہ تھا۔ مجھے راؤ راجہ کا شبہ ہے۔ اور میں ایک نہ ایک دن اس سے سمجھوں گا۔ (ایک لمحہ کے توقف کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر وہ پھر بولا)۔ دوست ظفر بابیں نے ایک مرتبہ ایک حسین شہزادی پر نظر ڈالی۔ وہ ایک کھڑکی سے کھڑی طلوع آفتاب کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ غضب کی حسین اور قطعی معصوم تھی۔ وہ مجھے بالکل نہیں جانتی تھی۔ میں اس پر شیدا تھا۔ اور اسکو اپنی ملکہ بناتا۔ میں اسکے قدموں کے نیچے موتی بچھا دیتا۔ اور اسکی آغوش میں مجھ کو بہشت کا لطف ملتا۔ لیکن جس صبح کو میں نے اسے دیکھا تھا اسی شام کو وہ قضا کر گئی۔

امیر:۔ یار عزیز اس قصہ پارینہ میں کیا رکھا ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ بادشاہ کی بیٹی کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ رقیب کے چنگل سے چھڑا کر اس پر قبضہ کر۔ نجابت خاں کی آن بان پر کون عورت شیدا نہ ہوجائیگی۔ جب جہاں آرا بیگم تیرے حرم میں آئیگی تو گویا وہ جنت میں داخل ہوگی۔ جنت میں قدم رکھتے ہی وہ از سر نو معصوم بن جائیگی۔ اور کیا چاہئے۔

نجابت خاں:۔ (اسکے چہرہ پر تبسم نمودار نہ ہوا وہ ویسے ہی طیش میں کہتا رہا) میں اسی وقت اپنے شکار کو رقیب کے چنگل سے چھڑا کر قبضہ میں لانے کا عزم کرونگا جب مجھے یہ اطمینان ہوجائے کہ ہمارا رقیب میرے ہم رتبہ اور میرا ہمسر ہے ہاں اگر جہاں آرا میرے حرم سے نکل کر کسی کافر کے گھر پڑ جائے تو لئے اختیار ہے کہ وہ اسکو جنت کی حور سمجھ کر ہر لحظہ قدمبوس

ہوا کرے :

اس کے بعد کی گفتگو میں نے نہیں سنی کیونکہ میں بیہوش ہوگئی تھی - جب میں ہوش میں آئی تو آدھی رات گزر رہی تھی - میرا بدن یخ تھا - یہ دونوں چلدیئے تھے - میں اٹھی اور چل کھڑی ہوئی - بلا ارادہ مہتاب باغ پہنچی - اب رات ہوچکی تھی - نوکر چاکر ہاتھوں میں روشنی لئے ہوئے سانپ بچھوؤں کی کھوج کر رہے تھے - مجھے کسی نے نہیں دیکھا - نہ میں نے کسی کی پروا کی - روش کے دونوں جانب سرو سنتریوں کی طرح کھڑے تھے - چمیلی - بیلے اور نرگس کی خوشبو سے دماغ کو تسکین ہوتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھلی معلوم ہوتی تھی - آبشار کے اوپر ایک برج اور چبوترہ تھا - بجز شمع و فانوس کے وہاں اور کوئی نہ تھا - میں وہاں تھک کر بیٹھ گئی - رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ عورت کی زندگی بھی کس مصیبت کا سامنا ہے - یہ بھی کیسی بے بس ہستی ہے - مرد عورت کی عصمت و پاکبازی کا نگہبان بنتا ہے - کیوں؟ اس لئے کہ بلا شرکت غیرے اسکا حظ اٹھائے - اس کو کیا خبر کہ عورت کے دل پر کیا بیتتی ہے - وہ اپنے سوز نہانی سے کس طرح پھنکی جاتی ہے - میں آبشار کی طرف جھکی - پانی ہاتھ میں لیکر منہ دھویا - منہ کی تمتماہٹ کچھ کم ہوئی لیکن خیال نے مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کیا - کہ لاکھ دھوؤں پیشانی کا یہ داغ بے حرمتی اب کبھی نہیں مٹ سکتا - مردوں کو اپنی قوت و ہمت پر بڑا ناز ہوتا ہے - نجابت خاں بھی اپنے تئیں بڑا اولوالعزم اور ہمت والا سمجھتا ہے - مگر جب وہ ایک عورت کے دکھ درد کا بوجھ بانٹنے کی ہمت و شرافت نہیں رکھتا تو میری نظر میں اسکی لیاقت ہی کیا رہ سکتی ہے - اس وقت مجھے پھر اپنا راکھی بند بھائی یاد آیا - وہی ایک شخص تھا جسے میں چاہتی تھی - اور جس کی محبت کا خیال آج تک مجھے بے چین رکھتا تھا - اس کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی - اسکی چمکتی ہوئی آنکھیں میرے اوپر جھک گئیں - اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں - میں نے اپنے گلے میں اس تعویذ کو ٹٹولا جس میں میں نے اسکا پہلا نامۂ شوق نشانی سمجھ کر اپنے سینہ سے لگا رکھا تھا - پھر معاً مجھے اس کے آخری خط کی وہ سطریں یاد آئیں - جنہوں نے میرے نہال امید کو پژمردہ کیا - اور میرے دل کو ٹھکرا کر پاش پاش کر دیا تھا - یہ سوچتے ہی کہ کیا وہ بھی نجابت خاں کی طرح ہمت و شرافت سے نا آشنا اور کٹھور ہے - میں تڑپ گئی - ضبط ہاتھ سے جاتا رہا - ہوش و حواس جواب دینے لگے - بیساختہ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی - اور میں بیہوش ہوگئی - دوسرے دن محل میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پچھلی رات مہتاب باغ میں جہاں آرا بیگم کو کسی سانپ نے کاٹ لیا -

(باقی)

پنڈت کشن پرشاد کول

فلسفۂ مذہب صرف آٹھ آنہ میں

اردو میں پہلی کتاب ہے - جو اسلامی شعائر و عقاید پر ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اسکا مطالعہ کرے - چونکہ اسکی جلدیں کم رہ گئی ہیں اس لئے اسٹاک ختم کرنے کیلئے بجائے ایک روپیہ کے ۸ر میں مل سکتی ہے محصول اسکے علاوہ ہوگا -

(منیجر نگار)

بُندے

کمرے میں ایک چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ اس کو دیکھنے کے لئے میں نے چراغ اٹھایا۔ خبر نہیں کہ میری نیند کیوں اُڑ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں اگلی صبح کو روانہ ہونیوالا تھا۔

یہ عجیب و غریب تصویر ایک بیش قیمت سنہرے چوکٹے میں جڑی ہوئی تھی۔ ایک عورت اپنے سر کو مخملی تکئیے پر رکھے ہوئے تھی۔ اسکا ایک بازو ذرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اور شانہ و سینہ کا کچھ حصہ سیاہ بیک گراؤنڈ میں بالکل برہنہ نظر آرہا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا یہ تصویر چھوٹی سی تھی۔ جس میں ایک نوجوان لڑکی اپنے داہنے بازو کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن صرف اُسکا سر جو مخملی تکئیے پر ہونے کی وجہ سے کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اسکی گردن۔ ایک بازو اور سینہ کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔

مصوّر نے اس تصویر کو کچھ اس طرح بنایا تھا کہ دیکھنے والا خود مصوّر کے وجود کو اس طرح محسوس کرنے لگتا تھا جیسے وہ اپنا مُنہ تکئیے کے قریب رکھے ہوئے محو نظارہ ہو۔ سراپا ایسا خوبصورت تھا جس کو انسان بس خواب ہی میں دیکھ سکتا ہے ——— رُخساروں کی گلگونی۔ نیم وا آنکھوں کی گہری سُرمگینی۔ ریشم سے زیادہ نرم اور چمکیلے بالوں کی آرائش۔ لبوں کی سُرخی۔ حسین کتابی چہرہ! علیحدہ علیحدہ اور یکجائی طور پر ——— حُزن آفرین سیاہ بیک گراؤنڈ پر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نمایاں تھا۔ بائیں کان کی لَو میں مجھے ایک عجیب بُندا نظر آیا ——— ننھا کیوپڈ اپنی کمان دونوں ہاتھوں سے اُٹھائے ہوئے ایک حلقہ میں آویزاں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ مہین طلائی زنجیر سے جس نے اس کے نازک سیپ کے سے کان کیساتھ مقیّد کر رکھا تھا۔ خود کو آزاد کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ کیسا عجیب بُندا تھا!

لیکن تصویر میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات اُس حسینہ کا انداز تھا۔ اسکا کسی قدر پیچھے کی طرف جھکا ہوا سر۔ وہ نیم وا آنکھیں۔ وہ شبنم کی تازگی اور شراب کی سی کیفیت رکھنے والے لب جو ایک بوسہ کے ملتجی نظر آتے تھے۔ اور اُن پر وہ ہلکا سا تبسم! ——— فرطِ لذت سے میں کچھ ایسا مسحور ہو گیا کہ مجھے اسکی معطر سانس تک محسوس ہونے لگی۔ اسکا بلوری بازو جس کے نیچے ریشمی چمکیلے بالوں کے چھلّے نظر آرہے تھے اس طرح اُوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا گویا کسی کے گلے میں حمائل ہو جانیوالا ہے۔ میں مصوّر کے کمالِ فن اور قوّتِ تخلیق کو دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ تصویر میں ایک خاص سحر آفرینی تھی۔ فانوس کی مُرتعش روشنی میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور اُس کے یاقوتی لب متحرک ہو گئے۔ شاید یہ حماقت تھی لیکن میں نے اپنے لب اُس کے لبِ لعلین سے ملا دیئے ——— ایک بار نہیں بلکہ مسلسل و متواتر کئی بار ——— اور اسکے بعد دفعتاً میں خوفزدہ ہو گیا ———

خون آلود مجسموں اور پُر اسرار تصویروں کے افسانے مجھے یاد آنے لگے اور ایک نئے مکان اور ایک اجنبی شہر میں تنہا ہونے کی وجہ سے میرے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ میں نے فانوس کو میز پر رکھا اور پھر سونے کے لئے پلنگ پر دراز ہوگیا۔

لیکن نیند آنی مشکل تھی۔ جب ذرا بھی غنودگی مجھ پر طاری ہوتی تو مجھے اپنے تکیئے پر حسینہ کا سر نظر آتا ——— وہی ہلکا سا تبسم۔ وہی لبوں کی سُرخی۔ وہی بالوں کی نرمی اور خوشبو۔ وہی کافوری سینہ کی عُریانیاں اور وہی خواہش سپردگی ——— میں اُٹھ بیٹھا۔ کپڑے پہنے۔ فانوس کو گُل کردیا اور تاریکی میں کچھ سوچنے لگا۔ وقت گذرتا گیا۔ حتیٰ کہ دریچہ سے آفتاب کی ہلکی ہلکی زرد کرنیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔

خادم نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے زور سے کہا ——— "جہاز دو گھنٹہ بعد روانہ ہوجائیگا"۔

روانگی سے قبل میں نے مالک مکان سے تصویر کے متعلق دریافت کیا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:۔ "اس کو ایک دیوانے نے بنایا تھا"۔

"لیکن وہ تھا کون؟ وہ دیوانہ ہو یا نہ ہو لیکن بڑا زبردست آرٹسٹ تھا"۔

"مجھے اس کا نام تک یاد نہیں رہا۔ یہ تصویر اُس نے پاگل خانہ میں بنائی تھی۔ اور اس سے اسکو سکونِ قلب حاصل ہوگیا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد میں نے یہ تصویر اُس کے رشتہ داروں سے لے لی۔ اُن لوگوں نے اس کے معاوضہ میں رقم لینے سے انکار کردیا۔ اور کہنے لگے کہ وہ بخوشی اس کو جُدا کردینا چاہتے ہیں"۔

تصویر کا خیال کلیتہً میرے دل سے فراموش ہوچکا تھا۔ تقریباً پانچ سال بعد میں میکسیکو کے کسی شہر کی ایک سڑک پر چلا جارہا تھا کہ دفعتاً ایک ہسپانوی جوہری کی دوکان میں ایک خاص چیز نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرلی۔ بُندوں کی ایک جوڑی ——— ایک مہین طلائی زنجیر میں لگے ہوئے دو ننھے کیوپڈ ——— مجھے فوراً تصویر اور اُس رات کا خیال آگیا!

جوہری نے کہا:۔ "میں ان کو اس وقت تک فروخت نہ کرونگا جب تک ان کی کافی قیمت نہ آجائے۔ ایسے بندے آپ کو کسی اور جگہ نہیں ملیں گے۔ میں ان کے بنانے والے کو جانتا ہوں۔ یہ ایک آرٹسٹ نے بنوائے تھے۔ اور انکا نمونہ خود اُس نے بنایا تھا۔ وہ ایک عورت کو تحفتاً دینا چاہتا تھا"۔

"کیا وہ ہسپانوی تھی"؟

"جی نہیں۔ امریکن"۔

"حسین۔ سُرمگیں آنکھوں والی ——— اُسکی عمر شاید اُسوقت بیس سال کی ہوگی ——— اُسکا رنگ گلابی تھا"؟

"تو آپ اُس سے واقف ہیں؟ اُس کو جوزی فیٹا کہتے تھے۔ آپ کو علم ہے اُس نے اُسکو مار ڈالا تھا؟"———

——— مرنے کے بعد بھی اُس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم تھا۔ جیسے کسی نے سوتے میں اُسکو مار ڈالا ہو۔ بعد میں مجھے یہ بُندے ایک جگہ فروخت ہوتے ہوئے مل گئے۔"

"اور آرٹسٹ کا کیا ہوا؟"

"وہ پیرس میں مر گیا——— دیوانہ ہوکر۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل کرنے کے وقت دیوانہ ہوگیا تھا۔ اگر در اصل آپ کو بندوں کی ضرورت ہے تو میں ان کو تین سو میں فروخت کردوں گا۔ ان کی اصل لاگت ساڑھے چھ سو کی ہے۔"

سید محمد احسن۔ بی اے۔ حیدرآبادی

(ہیرن)

سرمہ۔ کاجل۔ چورن۔ منجن

ایڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر عرصہ ہوا نگار میں ظاہر کی ہے۔

کاجل ۔ آشوب سُرخی ضعف بصارت کیلئے ازبس مفید ہے۔ ایک ڈبہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت عہ

سرمہ ۔ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے۔ اس میں ممیرہ نہیں بلکہ معمولی سرمہ ہے۔ جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول۔

چورن ۔ یہ وہ اکسیر چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد قبض۔ نفخ۔ ریاح کا پیدا ہونا۔ سوء ہضم۔ دستوں کا آنا۔ سب یکلخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھالینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن ۔ اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔

نوٹ :۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

پتہ:۔ م بیگم۔ ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

"کسبی"

اگست سنہ ۴۳ء کے "نگار" میں حضرتِ بزمی کا ایک دلچسپ مقالہ "کسبی" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا۔ اسکا مطالعہ کرتے ہی خیال ہوا کہ اسکا جواب لکھنا چاہیئے۔ مگر مطلق فرصت نہ ملی۔ اس لئے ارادہ ملتوی ہوتا گیا۔ یہانتک کہ فروری کے "نگار" میں باب المراسلۃ کے تحت میں ڈاکٹر محمد الیاس کا اعتراض نیاز صاحب کے نوٹ کیساتھ شائع ہوا۔ جس نے میرے سوئے ہوئے احساسات کو بیدار کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت معقول اعتراض کئے۔ اور مضمون کا رد بھی اچھی طرح قلمبند کیا۔ جس کی بابت نیاز صاحب نے لکھا کہ بزمی کے مقالہ کا جواب رزمی انداز میں نہیں دینا چاہیئے تھا۔ جو محض مذاق ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے سنجیدگی کے دائرے سے ہٹ کر کوئی جنگ کی صورت اختیار کی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانا غیر ضروری تھا۔ کہ دفعتہً مارچ کے "نگار" میں ایک نسوانی مضراب سے پھر انہی تاروں کو چھیڑ دیا گیا۔ اس میں دہلی کی کسی طوائف ——— اختر ریحانہ ——— کا خط شائع ہوا۔ جو اسی ضمن میں ہے۔ لیکن نفسِ مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ بلکہ اس میں ایک آپ بیتی بیان کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ مرد نہایت ظالم و جابر اور نفس پرست ہے۔ اس پر بھی نیاز صاحب کا ایک نوٹ ہے۔ جس میں ریحانہ کے ساتھ بہت کچھ اظہارِ ہمدردی کیا گیا ہے۔ ریحانہ کا خط پڑھ کر اس کے طرزِ تحریر سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس امر کی ہوئی کہ میرے وطنِ عزیز کی ایک بازاری عورت بھی اس لطیف اندازِ بیان کی مالک ہے۔ جو بعض صوبجات کے علم دوست حضرات کو بھی نصیب نہیں۔

یہ خلاصہ اس لئے پیش کر دیا گیا ہے کہ جن حضرات نے "نگار" کا مسلسل مطالعہ نہیں کیا ہے وہ اس موضوع کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

بزمی صاحب نے اپنے مقالہ کے شروع میں لکھا ہے کہ اس موضوع پر خالص علمی حیثیت سے غور کیا جائیگا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو موضوع عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر صرف علمی موشگافیاں کافی نہیں۔ بلکہ صاحبِ مضمون کو کچھ ذاتی مشاہدات بھی پیش کرنے چاہیئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں بالکل مدلل اور منطقی ہے۔ حالانکہ اس میں کئی جگہ مغالطے سے کام لیا گیا ہے۔ اصل موضوع پر قلم فرسائی کرنے سے قبل انہوں نے فلسفۂ جرم پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر وہ اس کو سمجھنے میں ناکامیاب رہ گئے۔ ان کے بیان کے مطابق گناہ۔ جرم۔ خطا۔ قصور اور بداخلاقی سب یکساں افعال اور ایک حد تک ہم معنی ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت گہرا فرق ہے۔

اگر ایک شخص مذہبی احکام کی پابندی نہیں کرتا۔ اور اُن سے انحراف کرتے ہوئے ایسے افعال کا ارتکاب کرتا ہے۔ جو مذہبی نقطۂ نظر سے مذموم ہیں۔ تو وہ گناہگار ٹھہرایا جائیگا۔ (رہتا ہے۔ اسکی پاداش اس دُنیا میں ملتی ہے اور آخرت میں بھی۔ جس کا علم مولویوں کو ہے) ایک شخص حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ مجرم ہے۔ اور حکومت نے ہر جرم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ مانا کہ بعض جرم بھی گناہ کے دائرے میں ہیں۔ مثلاً زناکاری۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود زبردست اختلاف ہے۔ یعنی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق صرف وہ زنا جرم ہے جو بالجبر ہو۔ مگر مذہب کا دائرہ غیر محدود ہے۔ برخلاف اس کے عبادت نہ کرنا۔ یا خدا کی وحدانیت و تثلیث کا قائل ہونا یا ہر قوی شے کو خدا سمجھنا جرم نہیں صرف گناہ ہے۔ اس کے بعد ایسی باتیں بھی ہیں جن کے لئے سوسائٹی نے کچھ اصول مقرر کئے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی نہ گناہ ہے نہ جرم۔ بلکہ بداخلاقی میں ان کا شمار ہے۔ برنی صاحب "بخل" کو شخصی جرم بتاتے ہیں۔ میں متفق نہیں ہوں۔ کیا وہ بتائیں گے کہ تعزیرات ہند میں اس جرم کے لئے کونسی دفعہ موجود ہے۔ انہی غلط فہمیوں کی بناء پر انہوں نے "جرم یا گناہ" کی تعریف غلط کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر کوئی مضر اثر مترتب ہو"

ذرا سوچیے! کہ ایک غریب شخص جنگل میں مٹی کھودنے جاتا ہے۔ اتفاق سے اُسے ایک دفینہ مل جاتا ہے۔ وہ چپکے سے اُسے لے آتا ہے۔ اس فعل سے اسکی ذات پر یا سوسائٹی پر کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اسکی اور اسکے خاندان کی حالت سُدھر گئی۔ پھر بھی حکومت کی نظر میں وہ مجرم ہے۔ برخلاف اس کے ایک شخص طبیب کی ہدایات کو مدنظر نہیں رکھتا۔ اور وہ اغذیہ کھالیتا ہے جو اسکی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اسکا یہ فعل نہ گناہ ہے نہ جرم۔ پھر بھی اسکا اثر خود اسکی ذات پر ہوا۔ اور سوسائٹی کے ایک محدود طبقہ پر بھی۔ یعنی اُن افراد پر جو اسکی تیمارداری میں تھے۔ اب چونکہ ابتداء ہی میں برنی صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اصل موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بھی صدہا غلطیوں کا ارتکاب کرینگے۔ (اسکا جواب وہ خود دینگے کہ اپنے اس فعل سے وہ مجرم ہیں یا گناہگار؟ ۔۔۔ شخصی یا اجتماعی؟۔)

آگے چل کر آپ تحریر فرماتے ہیں:۔ "بہرحال فلسفۂ جرم کی اس مختصر سی تحقیق کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ عصمت فروشی کا وہ جرم جو شدت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے۔ شخصی جرم ہے یا اجتماعی"؟

مندرجہ بالا عبارت کے اس حصہ سے کہ "وہ جرم جو شدت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے"۔ یہ ظاہر ہوتا ہے اور بلحاظ نفس مضمون بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ برنی صاحب کسبی کی عصمت فروشی کو جرم نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسے ایک "شریف مقصد" بتاتے ہیں۔ فی الحال اس سے بحث نہیں کہ وہ "شریف مقصد" ہے یا ذلیل۔ کیونکہ صاحب مضمون نے اس کے ضمن میں اخلاقِ جلالی کی کچھ ایسی عبارت نقل کرکے ۔۔۔ جو قطعی بے محل ہے ۔۔۔ گویا قارئین کو دھمکا دیا کہ اگر

اعتراض کیا تو مرتد ہو جاؤ گے۔ چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ اخلاقِ جلالی میں یہی لکھا ہے۔ گویا وہ منجانب اللہ ہے۔ اور اسکا ہر نوشتہ اٹل ہے۔ لوگوں پر رعب جمانے کے لئے یہ اچھی ترکیب ہے کہ بطور حوالہ کہیں سے کوئی عبارت نقل کر دی۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مضمون لکھتے وقت "اخلاقِ جلالی" جیسی کتاب بھی ہمارے مطالعہ میں تھی۔ اور وہ بھی مطبوعہ نولکشور۔ بزمی صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس عبارت میں "شرفِ ہر علمے" زیر بحث ہے۔ "ہر عملے" نہیں۔ اور علم و عمل میں جو تفاوت ہے ظاہر ہے۔ دائرہ عمل کے کسی موضوع پر غور کرتے ہوئے ایسا حوالہ دینا جس سے کسی علم کے خوب و زشت پر روشنی پڑتی ہو۔ بالکل بے محل ہے۔ غالباً یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ وہ کسبی کے پیشہ کو خالص علمی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اوپر نقل کی ہوئی عبارت میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ وہ کسبی کے پیشہ کو جرم نہ سمجھتے ہوئے بھی اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ وہ جرم شخصی ہے یا جماعتی؟ یہ بالکل اس طرح ہوا کہ ایک ملحد جو سرے سے خدا کے وجود ہی کو نہ مانتا ہو اس کی صفات پر غور کرنے کے لئے بیٹھ جائے۔

اُن سے ایک اور بھی غلطی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک کسبی، ایک رقاصہ اور ایک مغنیہ کو بالکل ہم پیشہ تصور کر لیا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک عصمت فروش بازاری عورت رقص و غناء کی بھی ماہر ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مغنیہ یا ہر رقاصہ عصمت فروش ہو۔ ہارون الرشید کی بہن اپنے زمانہ کی بہترین مغنیہ تھی۔ لیکن کیا وہ کسبی تھی؟ یا آجکل بنگال میں موسیقی اس قدر عام ہے کہ جب تک ایک عورت رقص و سرود میں کافی مہارت حاصل نہ کرے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں جملہ صفاتِ نسائیت پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ پھر کیا وہ تمام شریف عورتیں کسبیاں ہیں؟ آپ لکھتے ہیں کہ "کسبی جس کے بنیادی مقاصد میں رقص و سرود اور سرور آفرینی شامل ہے۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے کچھ کم بلند نہیں"

مضمون کے نفسِ موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ کسبی کا صرف وہ فعلِ شنیعہ ان کے پیش نظر ہے۔ جسے ناجائز تعلق جنسی یا زیادہ وضاحت کیساتھ زناکاری کہتے ہیں۔ پھر اس میں رقص و غناء کو لا ٹھونسنا خلطِ مبحث نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر غناء اور عصمت فروشی ایک ہی فعل کے دو نام ہیں۔ تو بزمی صاحب اُن مردوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جو ماہرِ فنِ موسیقی ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ قیاس بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بزمی صاحب خدا رکھے ابھی نوجوان ہیں۔ اور باقتضائے عمر ایک کسبی کے فریبِ رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی زندگی کے مقصد کو سرور آفرینی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کاش! ان کو کسی ایسی کسبی سے سابقہ پڑ جائے جو اپنی عیاری اور مکر و فریب کے باوجود کبھی کبھی صداقت سے بھی کام لے لیتی ہو۔ تو وہ یقیناً ان کے سامنے تسلیم کر لیگی کہ اس کی زندگی کا واحد مقصد "حصولِ زر" ہے۔ اور حصہ بقدر جثہ کے مطابق اس کی کارگاہِ معصیت میں سرور آفرینی بقدر زر ہوتی ہے۔ اس کی منور عشرت گاہ مشابہ ہوتی ہے اس تاریک عکاسخانہ سے جہاں جگہ لینے سے پہلے یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ ٹکٹ کس قیمت کا خریدا گیا ہے۔ (یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک کسبی کی بزمِ طرب میں ہنگامۂ نشاط ان پیشہ ور مضمون نگاروں کے رشحاتِ قلم کی مانند ہوتا ہے جو مدیرانِ رسائل کی طرف سے پیشکردہ اجرت کو مدِنظر رکھ کر اسی معیار کا

مضمون لکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہاں اگر دو روپیہ فی صفحہ ہے تو وہاں دو روپیہ فی گھنٹہ) بزمی صاحب کا جمالیاتی معیار ملاحظہ ہو۔ کسبی کے متعلق رقمطراز ہیں۔ "وہ حسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی ہے"۔ اگر واقعی حسن عبارت ہے۔ لبوں پر جمے ہوئے لاکھے۔ چہرے پر ملے ہوئے غازے۔ رخسار پر بنے ہوئے خال۔ اور خوشبودار رغن سے سنولائے ہوئے بال سے تو خدا جانے ان شراب زدہ حسن پرستوں پر کس نوع کی کیفیت طاری ہو۔ اگر ایک کسبی کا محرم مسک جائے یا آستین پلٹ جانے کے بعد سینہ اور گردن کی جلد کا یا کلائی اور بازو کی سطح کا متضاد رنگ اُن پر منکشف ہو جائے۔

اُن کے نزدیک "عورت و مرد کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں۔ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیر منزل۔ (۳) آلام حیات سے کسی قدر آسودگی"۔ بالکل بجا ارشاد ہوا۔ لیکن ان کی اہمیت ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کے منطقی دماغ سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے۔ وہ بجائے خود بہت غور طلب ہے۔ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کس ہستی کا نام ہے بہت کچھ دماغی کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے کہ عورت نام ہے اُس عجیب الخلقت ہستی کا جو ایک بیوی اور ایک کسبی کے امتزاج باہمی سے (غالباً کیمیاوی طریقہ پر) دائرۂ وجود میں آئے۔ اور یہ بھی کسی آئندہ زمانہ میں ہو تو ہو۔ آجکل نہیں کیونکہ اس زمانہ میں دو قسم کی نامکمل عورتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک بیوی اور دوسری کسبی۔ جن میں سے بقول بزمی صاحب اول الذکر ان تین اہم اغراض میں سے صرف دو کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور موخر الذکر صرف تیسری غرض کے لئے مخصوص ہے۔

اچھا ذرا عصر جدید کی عورت کے رجحانات طبع کو مدِ نظر رکھ کر غور کیجئے۔ کہ یہ اغراض کس حد تک صحیح ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج نہ صرف یورپ اور امریکہ میں بلکہ ہندوستان میں بھی ضبط تولید کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔ اور پھر اس شدت کے ساتھ کہ ایک بھی بچہ کی پیدائش گوارا نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ مرد و زن کے اتصال کی دو اولین اغراض بزمی صاحب کے مضمون میں سے تلمزن ہو گئیں۔ رہ گئی تیسری غرض۔ سو اس ترقی یافتہ زمانہ میں آلام حیات سے کسی قدر ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ آسودگی حاصل کرنے کے لئے ہزاروں ذرائع عمل میں آ گئے ہیں۔ کیا دلچسپ کتابوں کے مطالعہ سے۔ روح افزا مقامات پر چہل قدمی کرنے سے۔ فرحت بخش مشروبات سے۔ بے تکلف دوستوں کی صحبت میں۔ سینما اور تھیئٹر کے وسیع کمروں میں زندگی کا حزن و ملال دور نہیں ہو سکتا؟ پھر بتائیے۔ کہ مرد و زن کے اتصال کا کونسا مقصد باقی رہ گیا۔ زمانہ کی گردش اس قدر سرعت کیساتھ واقعات زندگی میں تغیر رونما کر رہی ہے کہ کسی خاص چیز کا مقصد تعین کر دینا آسان کام نہیں ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بزمی صاحب نے ان مقاصد کا تعین ٹھیک طور پر کیا ہے تو کیا ڈاکٹر محمد الیاس کے خیال کے مطابق بیوی کی ذات سے ہر سہ اغراض کی تکمیل قطعی غیر ممکن ہے؟ اور کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام کسبیاں لاولد رہتی ہیں؟ مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بقائے نسل کی انتہائی آرزومند نظر آتی ہیں۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اسکی عمدہ پرورش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت کا نہیں رکھتیں۔ یہ صرف اس لئے کہ ان کے کاروبار معصیت کا سلسلہ کسی طرح منقطع نہ ہو جائے۔ لیکن بزمی صاحب ہیں کہ وہ ایک کسبی کی زندگی کا مقصد صرف یہ بتاتے ہیں کہ "وہ تھکے ہوئے دماغوں کو سکون اور مجروح روحوں کو راحت پہنچائے"۔ اس کے

معنی یہ ہوئے کہ دماغ صرف مردوں کے پاس ہے۔ عورتوں کے پاس نہیں۔ اور اگر ہوتا ہے تو کبھی تھکتا نہیں۔ اسی طرح اس کی روح کبھی مجروح نہیں ہوتی۔ ورنہ بتلایئے کہ عورت کو آلام حیات سے آسودہ کرنے کے لئے بزمی صاحب نے کیا تدبیر سوچی ہے۔ مرد کو پریشانیاں نصیب ہوئیں۔ اسکا دماغ تھکا۔ اسکی روح مجروح ہوئی تو اس نے فوراً اپنی جیب میں چند روپے ڈالے اور اس بازار کا راستہ لیا جہاں سکون فروخت ہوتا ہے۔ اور پھر گھر واپس آ گئے۔ تاکہ بقائے نسل کی غرض پوری ہو۔ اور اسکے بعد اُن کی شریک حیات تدبیر منزل میں منہمک ہو جائے۔ اب ذرا سوچئے کہ مرد کی طرح عورت بھی آلام حیات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسکا دماغ تھک جاتا ہے۔ اس کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ وہ سکون حاصل کرنے کے لئے کس کی دہلیز پر جائے؟ لہذا ضرورت ہے کہ ہماری سوسائٹی جو بزمی صاحب کے خیال کے مطابق ہر لحاظ سے عورت کی حق تلفی کرتی رہتی ہے۔ ملک میں ایسے "چکلے خانے" قایم کرا دے جہاں توی ہیکل مرد اپنے اڈے جمائیں تاکہ مرد و عورت کے اتصال کی تیسری غرض یعنی آلام حیات سے کسی قدر آسودگی اچھی طرح پوری ہو جایا کرے۔ کسبی کی حیات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

"وہ اتصالِ زوجین کی اس تیسری غرض کو اپنی حیات کا ایک مستقل موضوع بنا کر دُنیا کے سامنے لطف و انبساط کا دسترخوان چُنتی ہے۔ وہ عشوہ و کرشمہ کے باریک ترین نکات کا گہرا مطالعہ کرتی ہے۔ حُسن اور حُسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی ہے۔ اور پھر اپنی تحقیقات کے ہر ہر جزو کو انسانی زندگی کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جس سے دوچار ہونے کے بعد کائنات کی ساری فضائیں قوس قزح کے سے لطیف رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

اور میرا خیال ہے کہ اگر ملک میں "مردانہ چکلے خانے" قایم ہو گئے تو آیندہ اپنے مضمون میں حضرت بزمی کو ایک "مرد کسبی" کے متعلق ان الفاظ کا اضافہ کرنا پڑیگا:۔

"وہ اتصالِ زوجین کی اس تیسری غرض کو اپنی حیات کا مستقل موضوع بنا کر عورت کے سامنے لطف و انبساط کی میز چُنتا ہے۔ وہ ورزشِ جسمانی سے اپنے قواء کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ادویات استعمال کر کے ہمیشہ جوان بنا رہتا ہے۔ جس سے ہم آغوش ہونے کے بعد کائنات کی ساری فضا میں عورت کو آندھیوں کا جھکڑ اور سمندروں کا تلاطم محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس تند و تیز کیفیت کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ ایسی بیہوش کہ اُس پر ہزاروں ہوشمندیاں قربان ہوں۔ اس کے اعضاء مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ایسے اضمحلال کیساتھ جس پر نشاطِ روح کی ہزاروں فرحتیں نثار ہوں۔"

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ کیونکہ بزمی صاحب نے اپنے بچاؤ کا پہلے ہی سے خیال رکھتے ہوئے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ "اس وقت ہمارا موضوعِ بحث صرف عورت کی عصمت ہے۔" اور عورت سے بھی ان کا مطلب صرف "کسبی" ہے کتنی معقول بات ہے۔ عورت و مرد کے اتصال پر غور کیا جا رہا ہے اور صرف عورت کی عصمت موضوعِ بحث ہے۔

بزمی صاحب اس موضوع پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور فرما رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ نفسیات کے معمولی نکات کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں عورت سے کبھی دُور کا بھی واسطہ نہیں پڑا۔ وہ اسکی فطرت سے قطعی لاعلم ہیں۔ اگر

ایک عورت یہ سمجھلے کہ مرد و زن کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں جن میں سے دو کی تکمیل میرا شوہر میرے وسیلہ سے کرتا ہے اور تیسری غرض (جو کہ سب سے زیادہ اہم اور لطیف غرض ہے) پوری کرنے کے لئے وہ ایک کسبی کے مکان پر جاتا ہے۔ تو آتشِ حسد سے وہ جہنم کا دہکتا ہوا انگارا بن جائیگی۔ اور اس برہمی کے باعث خاوند کے ساتھ اسکا طرزِ عمل اس نوع کا ہوگا کہ پھر اس غریب کو کبھی سکون نصیب نہیں ہوگا۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو اس کے نزدیک عورت و مرد کے اتصال کا صرف ایک مقصد رہ جائیگا یعنی آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی۔ اور صرف اس غرض کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر وقت کسبی کے مکان پر پڑا رہیگا۔ نہ بقائے نسل کا خیال ہوگا۔ نہ تدبیرِ منزل کی فکر۔ بات تو اچھی ہے۔ خدا راس لائے۔

اب بیک جنبشِ قلم نصف سال کی مدت طے کر کے میں اگست سنہ ۳۴ء سے فروری سنہ ۳۵ء کے "نگار" کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔
ڈاکٹر محمد الیاس کے اعتراض پر اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جگہ بہت معقول ہے۔ البتہ وہ مقالہ جو اس سلسلہ میں نیاز صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے توجہ کا طالب ہے۔

نیاز صاحب کی ہر تحقیق مسلّم ہے۔ کیونکہ وہ نہایت کاوش سے کام لیکر کسی خاص نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنے کے لئے کہ "زنانِ بازاری کا وجود نتیجہ ہے مردوں کی آوارگی کا یا مردوں کی آوارگی نتیجہ ہے ان کے وجود کا" انھیں ذرا زیادہ غائر نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آوارگی کی ابتدا ہی کیونکر ہوئی؟ زنانِ بازاری کا وجود تو بہت بعد کی بات ہے۔ تاریخ کی کتابوں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چل سکے۔ ہم غور و فکر کے ذریعہ سے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ موجودہ یا ماضی قریب کا زمانہ اپنے واقعات کے لحاظ سے کبھی عہدِ قدیم میں بھی گذر چکا ہو۔ اور آج جن اسباب و علل کے زیرِ اثر آوارگی ظہور میں آرہی ہے عہدِ عتیق میں بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف عہدوں میں انسان کی خصائل و عادات مختلف رہی ہیں۔ مگر پھر بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک اور ہر عہد کے انسان میں یکساں پائی گئیں۔ اس زمانہ کو نظر انداز کرنے کے بعد جب قدرتی پیداوار کی فراوانی انسان کو حصولِ معاش کے لئے مجبور ہی نہ کرتی تھی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہر ملک اور ہر عہد میں یہ ذمہ داری مرد کے لئے مخصوص رہی ہے۔ اگرچہ صنفِ نازک نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مگر ناقابلِ ذکر طور پر۔ یعنی وہ کبھی کبھی مرد کا صرف ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔ اور چونکہ بقائے حیات کے لئے وسیلۂ معاش نہایت اہم ہے۔ اس لئے جائز طور پر ہمیشہ مرد کو اس امر کا گھمنڈ رہا کہ خدا کے بعد وہ عورت کا مربی ہے۔ اس احساسِ فوقیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورت کو اپنے سے کمتر درجہ کی ہستی سمجھنے لگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ جبکہ صبح سے شام تک سخت محنت کرکے اسے اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنی شریکِ حیات کے لئے بھی خورونوش کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ شاید اسی لئے قرآن شریف میں "الرجال قوامون علی النساء" کہکر مرد کو فوقیت عطا کی گئی ہے۔ مگر ہمیشہ عورت اس کوشش میں رہی کہ کسی نہ کسی طرح

وہ مرد کی ہمسری ہی نہیں بلکہ اس پر حاوی ہو جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ جب مرد پر نفسانی خواہشات کا شدید غلبہ ہوتا ہے تو اسے اپنی شخصیت کا مطلق خیال نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی اس خواہش کی تسکین کے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے لمحات عورتوں نے مرد سے ایسے ایسے وعدے لے لئے جس پر بعد میں اسکو پشیمان ہونا پڑا۔ اس طرح اگرچہ عورت ایک لحاظ سے حاوی ہو گئی۔ مگر اس کی نظر سے گر گئی۔ وہ اس کی طرف سے بدظن ہو گیا۔ اور اسے اس قدر نفرت ہوئی کہ آیندہ کے لئے اس مخصوص عورت سے ملتفت نہ ہونیکا تہیہ کر لیا۔ مگر پھر بھی اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے اسے ایک دُوسری عورت کا پہلو درکار تھا۔ جسے ملکی رسم ورواج کا خیال رکھتے ہوئے اس نے کھُلم کھُلا نہیں بلکہ پوشیدہ طریقہ پر حاصل کیا۔ بس یہیں سے آوارگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ عورت نے مرد سے کسی قسم کا وعدہ نہیں لیا۔ بلکہ ہیجانِ جذبات کے عین نازک لمحات میں جب مرد پر ایک طرح کی دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ عورت نے انتہائی اجتناب سے کام لیکر اسکی جائز خواہشات کو کماحقہٗ پورا نہ ہونے دیا۔ بلکہ ایک حد تک پامال کر دیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس طرح وہ مرد پر یہ ثابت کر دیگی کہ وہ خواہ کتنی ہی فوقیت رکھتا ہو زندگی کی سب سے بڑی مسرت حاصل کرنے کے لئے عورت کا محتاج ہے۔ ان واقعات کے ماتحت مرد نے لواطت، استمنا بالید اور استلذاذ بالحوش کے ذریعہ اپنی خواہشات کو پورا کر کے عورت پر یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ اس کے بغیر بھی آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس آتشِ انتقام کی جلن میں صنفِ نازک کو صفحۂ ہستی سے بالکل مٹا دینے کے لئے دخترکشی اختیار کی۔ مگر بقائے نسل کا سوال جب مدِ نظر ہوا تو اسے مجبور رہنا پڑا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے آجتک عورت کو اور خاص طور پر بیوی کو بقائے نسل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

(برقی صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو)

اگرچہ عورت کے پندار کو شکست دینے کے لئے مرد نے بعض خلافِ فطرت افعال کے ذریعہ اپنی خواہشات پوری کرنی شروع کر دیں۔ مگر حقیقتاً وہ لذت اسے نصیب نہ ہوئی جو صرف عورت ہی کی ذات سے ممکن ہے۔ اور چونکہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ اسکی خودپرستی کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اس لئے لطف ومحبت کی بجائے عورت پر جبر واستبداد کے ذریعہ قبضہ حاصل کرنا شروع کیا۔ جنسِ بازاری سمجھتے ہوئے تجارتی منڈیوں میں گائے بکریوں کی طرح اس کی خرید وفروخت شروع کر دی۔ اور اس طرح عورت جو سمجھی تھی کہ ایک دفعہ مرد کے جذبات کو ٹھکرا کر اسے اپنا حلقہ بگوش غلام بنا لے گی۔ خود اس کی زرخرید لونڈی بن گئی۔ پھر یہ ہوا کہ جب تک چاہا مرد نے ایک عورت کو اپنے پاس رکھا اور جب طبیعت اُکتائی تو بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ حقیقتاً اسی عہد سے کسبی کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اور اس کے لئے خود عورت موردِ الزام ہے۔ لہذا نیاز صاحب کا یہ لکھنا غلط ہے کہ "رواج فحاشی کی ابتداء مرد کی طرف سے ہوئی۔ اور عورت نے اسے مجبوراً صرف اس لئے اختیار کیا کہ مرد زبردستی اسے اس سطح پر گھسیٹ کر لے آیا تھا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گناہِ عظیم کو کس طرح دُور کیا جائے۔ مرد اپنے جذبات کو قابو میں رکھے یا کسبی نوسو چوہے کھائے بغیر حج کے لئے چلی جائے۔ سو اسکا حل نہایت آسان ہے۔ فحاشی کی ابتداء چونکہ عورت کی طرف سے ہوئی تھی۔

اس لئے اس کی روک تھام بھی وہی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ بازاری عورت کے بس کا کام نہیں۔ کیونکہ معصیت کی نگری سے جس کی فضا بظاہر رنگین اور لطیف ہوتی ہے۔ بچ نکلنا آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ فرض ہے چار دیواری میں رہنے والی اُن خواتین کا جن کے شوہر بقول حضرت بزمی "آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی" حاصل کرنے کے لئے ایک بازاری عورت کے کوٹھے پر جانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنے ہی گھر میں ملّت وانبساط اور خلوص ومحبت کے ذریعہ ایک ایسی فضا پیدا کر دیں کہ مرد اسے نعم البدل ہی نہ سمجھے بلکہ ان کے مقابلہ میں کسبی کی ہر ادا کو فریب کارانہ اور غیر فطری جان کر ٹھکرا دے۔ اور عورت کے لئے یہ اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ وہ اپنے احساسِ فوقیت کو دل سے دور نہ کر دے۔ عورت کا وقار اسی میں ہے کہ مرد کو اپنا عائدِ اعظم تصوّر کرے۔

نیازؔ صاحب کسبی کو بے قصور بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی بازاری عورت دبردستی مرد کو اس کے گھر سے گھسیٹ کر لے گئی ہو؟ کیا اس نے ایسا کیا ہے کہ وہ راہ چلتے آدمی کو بجبر اپنے کوٹھے پر کھینچ لائی ہو" میرا خیال ہے کہ موصوف کا مشاہدہ بہت وسیع نہیں۔ ورنہ اس متمدن زمانہ میں بھی سرزمین ہند کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں حقیقتاً عورت بجبر مرد کو ارتکاب معصیت کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ علاوہ اس کے کسبی کا بن سنور کر کوٹھے پر بیٹھنا نیچے سے اُوپر کھینچ لینے ہی کے برابر ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچنے کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ کر کہیں نہیں جاتا۔ بلکہ اپنی کشش کے ذریعہ دور ہی سے ریزۂ آہن کو کھینچ لیتا ہے۔ ایک تو نسائیت اور پھر تزئینِ جمال۔ مرد کو خود بخود اس طرف کھینچ جانا لازمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شراب کی کشید اسی لئے ہے کہ انسان اسے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شراب کو مضرت رساں بھی نہ کہا جائے۔ کسبی کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے یا نہ ٹھہرایا جائے مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اسکا وجود تباہ کن ہے۔

اب "نگار" بابت مارچ ۱۹۳۵ء کے صفحات مدِ نظر ہیں:۔

اختر ریحانہ کا مراسلہ اتنا ہی دلچسپ اور دلفریب ہے جتنا خود ان کا نام۔ اس کے مطالعہ سے نیازؔ صاحب کی طرح مجھے بھی اُن سے ہمدردی ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ معصیت کے ساتھ مظلومیت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ حد درجہ ذی شعور ہونے کے باوجود وہ اس رنگین گردابِ معصیت سے بچ نکلنے کی تدبیر نہیں جانتیں۔ خیر وہ میری ہی ہم وطن ہیں۔ اور اگر کبھی شرفِ نیاز حاصل ہوا تو انھیں بتاؤں گا کہ اس دنیا کے بہت سے پیغمبر اپنی ابتدائی زندگی میں حد درجہ گناہگار اور عصیاں کار تھے۔ چنانچہ ایک نیک خاتون بن جانا اُن کے لئے بھی ممکن ہے۔ اس مراسلہ پر بھی نیازؔ صاحب نے حاشیہ آرائی کی ہے۔ جس کا آخری حصّہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ "اب عورت کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ مرد کے کام ودہن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جو کسی وقت عورت نے گوارا کی تھیں۔ اور عنقریب وہ اپنا وجود علیحدہ قایم کرنے میں مرد کے جذبات اس طرح ٹھکرا دے گی جس طرح اس سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔ لیکن نیازؔ صاحب نے تاریخ کے

اس قدیم عہد کو فراموش کر دیا۔ جو عصر جدید کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی عورتیں مردوں کے نہ صرف دوش بدوش ہوئی تھیں بلکہ اس سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر لیکر اس نے مرد کو ہر کام سے سبکدوش کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرد کو ہوش آیا۔ تو اُس نے جلدی ہی اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ کیونکہ وہ اسکا پیدائشی حق تھا۔ اور اُس نے عورت کی اس فوقیت کو جسے بڑی کاوش کے ساتھ کافی مدت میں حاصل کیا گیا تھا۔ ایک جھٹکے میں قعر مذلت کے اندر گرا دیا۔ اور جس طرح آج برطانوی حکومت نے عزت و وقار کے تمام شعبوں کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص کر کے ہندوستانیوں کو محض مزدور بنا رکھا ہے۔ عورت مویشیوں کے مانند صرف بار برداری کے کام آنے لگی۔ آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ عورت نے وہی قدیم روش اختیار کی ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ کرسیٔ عدالت ہی پر متمکن نہیں ہے۔ بلکہ محنت و مشقت کے کام میں بھی برابر کا حصہ لے رہی ہے۔ تاریخ اپنے واقعات کو مکمل طور پر دہرا کر رہیگی۔ چنانچہ عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے جبکہ مرد ایک ملکوتی شان کیساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہوا نظر آئیگا جسے عورت اپنے شانوں کی مدد سے گھسیٹ رہی ہوگی۔ کیونکہ عورت اگر حرم کی چار دیواری میں ملکہ بن کر رہنا پسند نہیں کرتی تو اسے کنیز بنا کر رکھنا ہی پڑیگا ؛

"ق"

(نگار) آپ نے جس نقطۂ نظر سے جناب برزی کے مضمون پر ایراد کیا ہے۔ وہ یقیناً توجہ کے قابل ہے۔ اور ادارۂ فحاشی کی ضرورت کو صرف اس لئے تسلیم کرنا کہ اس میں ایک پہلو مرد کی تفریح کا بھی پایا جاتا ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دُنیا کی کوئی بداخلاقی یا معصیت ایسی نہیں ہے جس پر کوئی لذتِ نفس یا فرحت دماغ نہ پائی جائے۔ اور اگر جوازِ معصیت کیلئے صرف یہ دلیل کافی ہو تو سوسائٹی کا کوئی قانون قابلِ توجہ نہ رہیگا۔ اور تمدن و معاشرت کے لئے کوئی اصول متعین نہ ہو سکیگا۔

اس میں شک نہیں کہ غناء و موسیقی کو دماغ انسانی کی تفریح و تسکین میں بڑا دخل حاصل ہے۔ لیکن اگر یہ چیز ہمیں صرف اسی طرح میسر آ سکتی ہے کہ ہم کو اپنے اخلاق کو داغدار اور اصول معاشرت کے اجتماعی پہلو کو نظر انداز کرنا پڑے تو یقیناً ایسی تفریح و دلچسپی قابلِ احتراز ہوگی۔ اور انفرادی سکون دماغ پر مصالح اجتماعی کا قربان کر دینا کسی طرح جائز قرار نہ پائیگا۔ لیکن سوال اس وقت یہ نہیں ہے کہ زنانِ بازاری کی جماعت قابلِ مذمت ہے، یا نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہ سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اور اگر یہ ناممکن ہے تو کیا دُنیا سے ادارۂ فحاشی کو محو کر کے اس طبقہ کو فنا کر دینا ممکن ہے۔

تاریخ کے اوراق اور نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ دونوں اس باب میں ہم کو صرف اس ایک نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ عہد قدیم سے اس وقت تک کوئی زمانہ فحاشی سے خالی نہیں رہا۔ اور باوجود انتہائی کوشش کے دُنیا کی کوئی حکومت

اسکا استیصال نہیں کر سکی - حتیٰ کہ مذہب بھی جو ہر وقت جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے اپنے ہاتھ میں لئے اسکا تعاقب کر رہا تھا - وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا - اب اس کے ساتھ اس امر پر بھی غور کیجئے کہ ان تمام ناکامیوں کا کیا سبب تھا -

آپ فرماتے ہیں کہ اس کی تمام تر ذمہ داری عورت پر ہے - اور اسی نے مرد کو فحاشی پر مجبور کیا - میں اس کا جواب مرد کو قرار دیتا ہوں - اور اسی کو موردِ الزام سمجھتا ہوں - آپ نے جو استدلال کیا ہے وہ بالکل خلافِ حقیقت واقعہ ہے - کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ حکومت و سیاست کی ابتداء مرد کی طرف سے ہوئی اور تعلقِ جنسی کی قدیم ترین روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو ہمیشہ مالِ غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھایا گیا - اور اسکی ضمیر کی آزادی کا سوال مرد کے سامنے کبھی آیا ہی نہیں - رہ گیا آپ کا دوسرا شاعرانہ استدلال کہ ؏

درکشتنِ من اینہمہ بیباک چرائی

سو وہ بالکل اسی قبیل سے ہے - جیسا کہ کسی بھیڑیے نے کسی بکری کو کھا جانے کے لئے اس پر یہ الزام قائم کیا تھا کہ تو پانی کیوں گندہ کر رہی ہے - حالانکہ پانی کا بہاؤ بکری کی سمت سے نہ تھا - علاوہ اس کے آپ ان حکومتوں کی تاریخ دیکھیے جنہوں نے پیشہ ور عورتوں سے ملک کو خالی کر دیا تھا - آپ کو معلوم ہو گا کہ اس طبقہ کے فنا ہونے کے بعد مرد پھر بیتاب ہو گیا اور اپنی تشنگی و گرسنگی کی تاب نہ لا کر اس نے سوسائٹی کو اتنا داغدار بنا دیا کہ آخر کار ادارۂ فحاشی پھر قائم کرنا پڑا -

بہر حال جس حد تک نفس فحاشی کا تعلق ہے یقیناً کوئی شخص اسکی خرابیوں سے انکار نہیں کر سکتا - لیکن اس کیساتھ بزمی صاحب کے مضمون کا وہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو مرد کی تفریح و دلچسپی سے متعلق ہے -

مردوں کا اپنی بیویوں سے چھپکر زنانِ بازاری کی صحبت ڈھونڈھنا اکثر و بیشتر اسی بنا پر ہوا کرتا ہے کہ اُن کے بعض ذوق گھروں میں پورے نہیں ہوتے اور وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی اس خواہش تفریح کو دوسری جگہ پورا کریں - اس لئے صرف پیشہ ور عورتوں کو برا بھلا کہنے یا حفظانِ صحت کا لیکچر دینے سے تو یہ مسئلہ حل ہوتا نہیں - البتہ اگر خود گھروں کی عورتوں میں ایسا سلیقہ پیدا ہو جائے کہ وہ مردوں کی "رعایتِ ذوق" کا لحاظ رکھ سکیں تو بیشک ایک حد تک ادارۂ فحاشی کا انسداد ہو سکتا ہے - گو یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ عورتوں کا یہ سلیقہ اپنے اندر کتنے خطرناک امکانات رکھتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے جب مرد مجبور ہو کر یا تو رہبانیت اختیار کر لے یا فحاشی کے مفہوم کو بدلکر خود سوسائٹی کے لئے اسی کو گوارا بنا دے -

معلوم نہیں آپ اس سے باخبر ہیں یا نہیں - لیکن میں جانتا ہوں کہ تقریباً گذشتہ دس سال سے پیشہ ور عورتوں کے کاروبار میں برابر انحطاط پیدا ہوتا جا رہا ہے اور ان کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی ہے - اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عورتوں میں تعلیم کا رواج زیادہ ہو گیا ہے - اور انہوں نے اپنے رکھ رکھاؤ اور زیبائش و آرائش سے کام لیکر مرد پر زیادہ قابو حاصل کر لیا ہے - اسی کے ساتھ چونکہ پردہ بھی اٹھتا جا رہا ہے - اس لئے دوسری عورتوں سے ملنے جلنے کا

موقعہ بھی اُس کو زیادہ حاصل ہے۔ اور جو چیز اسکو زنان بازاری کی طرف کھینچکر لے جاتی تھی وہ اُسے گھر بیٹھے میسر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کی ان بڑھتی ہوئی رنگینیوں، طبقۂ شرفاء میں رقص و موسیقی کی طرف میلان عام۔ اور عورتوں کے موجودہ "آرائشِ خم کاکل" نے بعض محتاط دماغوں اور اخلاقیات کے قدیم پابندوں کو "اندیشہ ہائے دور و دراز" میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ پیچ و تاب بالکل بیکار ہے کیونکہ یہ موج اب بیچ میں توڑ کے رُکتی نہیں اسے ساحل سے جا کر ٹکرانا ضرور ہے۔ اور بالکل ممکن ہے کہ مغرب کی طرح مشرق میں بھی یہ گرداب ساحل ہی کو بہالے جائے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا فحاشی کے مفہوم کو بدلکر اسے سوسائٹی کے لئے گوارا بنانا پڑے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کی بناء پر میں نے اختر ریحانہ کی تحریر کا جواب دیتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ وہ زمانہ قریب آنیوالا ہے جب عورت تعلق جنسی کے ان تمام ناگوار پہلوؤں کو مرد کے لئے گوارا بنا دیگی اور اس باب میں سوسائٹی کے جو جدید قانون مرتب ہوں گے وہ عورت کے ترتیب دیئے ہوئے ہونگے نہ کہ مرد کے۔ مگر افسوس ہے کہ آپ اس پیشن گوئی سے لرز گئے۔ اور عورت کے اس متوقع اقتدار کی تردید میں آپ نے حقائق تاریخی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ذرا میں بھی تو سنوں وہ کونسا عہد تھا جب عورت مردوں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اور مرد نے ہوش میں آنے کے بعد اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اور اب وہ آثار کونسے ہیں جن کی بناء پر آپ اپنی ملکوتی شان عورت کے مقابلہ میں قایم رکھ سکیں گے۔ اور وہ آپکی کنیز بن کر رہنے پر مجبور ہوگی۔ معاف فرمایئے۔ خواب کی باتوں پر اس درجہ وثوق مناسب نہیں ؁

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں زمانہ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو مثلاً آتش۔ آرزو۔ آزاد بلگرامی۔ احسن مارہروی۔ اصغر گونڈوی۔ ڈاکٹر اقبال۔ امیر۔ انیس۔ بیخود۔ جگر۔ حزین۔ خواجو کرمانی۔ دبیر۔ ریاض۔ سودا۔ شرر۔ صائب۔ صفی۔ عالی شیرازی۔ عزیز لکھنوی۔ غالب۔ میر و ناسخ وغیرہ وغیرہ کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں۔ معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔

قیمت معہ محصول عہ/۔

منیجر نگار لکھنؤ

قوّتِ ارادی کے حیرتناک کرشمے

مسمریزم، ہپناٹزم یا عمل مقناطیسی اب محتاجِ تعارف نہیں رہا۔ اُردو داں طبقہ اس سے ایک حد تک واقف ہو چکا ہے۔ اور اسکے عامل بھی ہندوستان میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسکی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ انسان کے اندر ایک خاص قوت موجود ہے جسے قوّتِ ارادی کہتے ہیں۔ اور اسی سے کام لینے کا نام عمل مسمریزم بھی ہے اور سلب امراض بھی یہ حقیقتاً ایک اشارۂ نفسی ہے جو دوسرے کو متاثر کرتا ہے اور اس کے خیال کے اندر انقلاب پیدا کر کے کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔

اشارۂ نفسی کے سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم میں دو احساس ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک "حسِ شاعر" اور دُوسری "حسِ غیر شاعر"۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ہم کچھ کام دانستہ کرتے ہیں اور کچھ نادانستہ۔ دانستہ کام کو تو چھوڑیئے۔ اس "نادانستہ کاری" پر اکثر لوگ متعجب ہونگے۔ مگر ہم ایک دو مثالوں سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرینگے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ بعض آدمی سوتے سوتے اٹھ کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یا چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے "Somnambulism" کہتے ہیں۔ مجھے ایک حافظ صاحب کے متعلق علم ہے کہ انھیں یہی مرض تھا۔ آپ لاہور ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھے۔ علی الصباح اٹھ کر گھر سے انھیں کارخانہ جانا ہوتا تھا۔ جو تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ چنانچہ آپ بعض اوقات سوتے ہی سوتے گھر سے ورکشاپ تک جایا کرتے۔ اور لطف یہ کہ کہیں راہ میں ٹھوکر بھی نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نماز تراویح پڑھاتے پڑھاتے سو گئے مگر قرأت جاری رہی۔ مقتدی کھڑے کھڑے اکتا گئے تو بیٹھ گئے مگر حافظ صاحب ہیں کہ کہیں رُکتے ہی نہیں۔ لوگ بھتیرا "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" پکار رہے ہیں۔ مگر وہاں کون سُنتا ہے۔ آپ آٹھ سیپارے پڑھ گئے۔ اور پھر کہیں رکوع میں گئے۔ رکعت ختم کرنے پر پوچھا تو فرمایا "میں سو گیا تھا"۔ ایسے مریض بیدار ہونے پر یہ مطلق نہیں جانتے کہ بہ حالتِ خواب انہوں نے کیا کیا تھا۔ اسی طرح کبھی کبھی بعض شرابی انتہائے نشہ میں چاقو۔ تلوار۔ یا کوئی اور ہتھیار لیکر جو ہاتھ آجائے دیوانہ وار کسی پر حملہ کر دیتے ہیں۔ مگر جب ہوش میں آتے ہیں۔ تو متحیّر ہوتے ہیں۔ اور ہرگز انھیں باور نہیں آتا کہ وہ اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ان دو مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگرچہ دونوں شخصوں نے خود ہی سب کچھ کیا ہے۔ مگر وہ خود اس سے

بے خبر ہیں - گویا جو کچھ انہوں نے کیا نادانستہ کیا - نیند میں یا انتہائے سکر میں - یہ ان کی "حسِ غیر شاعر" تھی - جو مصروف کار تھی -

اگر ہم اس "نفسِ شاعر" اور "نفسِ غیر شاعر" کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ "نفسِ شاعر" کا حافظہ کچھ ایسا قابلِ اعتماد نہیں ہے - بخلاف "نفسِ غیر شاعر" کے حافظہ کے - کہ جو کچھ اس کے سپرد کر دیا - گویا نقش فی الحجر ہو گیا - پھر یہ بھی کہ "نفسِ غیر شاعر" سے جو کہیں گے یا جو اسے بتائیں گے وہ بغیر حجت و بحث کے اسے قبول کریگا - چنانچہ یہی وہ "نفسِ غیر شاعر" ہے جس کے ماتحت ہمارے دماغ اور احساسات کے تمام کل پرزے کام کر رہے ہیں - اور یہی وہ قوت کار رہے جسے ہم "داہمہ" کہتے ہیں - یہی "داہمہ" ہے جو ہماری "قوتِ ارادی" پر حاوی ہے - بلکہ جب کبھی "ارادہ" اور "داہمہ" میں کشمکش ہوئی یا ایک دوسرے کے مقابل ہو گیا تو ہمیشہ "داہمہ" ہی کو فتح نصیب ہوئی - "ارادہ" کے لغوی معنی ہیں "کسی کام کے متعلق خود مختارانہ سوچنا" "ذہن کی وہ خاصیت یا قوت جس سے ہم کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق سوچتے ہیں" "ذہن کی وہ قوتِ اختیار جو اسے اپنے اعمال پر حاصل ہے" اس تعریف کو اور ان معانی کو ہم ہمیشہ سے درست اور ناقابلِ تردید سمجھتے آئے ہیں - حالانکہ دراصل یہ سراسر نادرست اور دروغ ہے - یہ "قوتِ ارادی" جسے ہم "خود مختار" سمجھتے ہیں - اور جس پر ہمارا بڑا وثوق ہے ہمیشہ "داہمہ" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے -

فرض کیجئے ہم ایک فٹ چوڑا اور کافی لمبا تختہ لکڑی کا زمین پر بچھا دیتے ہیں - ظاہر ہے کہ ہر شخص باسانی اس پر سے گذر جائیگا - اب اسی تختہ کو سو سو فٹ کے دو بلند میناروں پر رکھ دو - تو کسی کو ان پر سے گذرنے کی جرأت نہ ہوگی - تم دو ہی قدم چلو گے کہ کانپنے لگ جاؤ گے - اور باوجود اپنے ارادے کی تمام کوشش صرف کرنے کے تمہارا زمین پر گر جانا یقینی ہوگا - پھر یہ کیا بات ہے کہ تختہ زمین پر تھا تو آپ آسانی سے عبور کر گئے - اور بلندی پر تھا تو دو قدم بھی نہ چل سکے؟ بات یہ ہے کہ پہلی حالت میں تو آپکا خیال یہ تھا کہ اس سے گذر جانا آسان ہے اور دوسری حالت میں آپ نے اسکو دشوار سمجھا - اگر معمار اور رنگ ساز اونچے اونچے دیواروں پر پاڑیں باندھ کر باسانی کام کرتے پھرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذہن میں گرنے کا وہم ہی نہیں پیدا ہوتا - ایک یعنی بے خوابی کی حالت کا اندازہ کرو - اگر وہ سونے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتا تو آرام سے بستر میں پڑا جاگتا رہتا ہے - بخلاف اس کے اگر وہ سونے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اپنی قوتِ ارادی پر زور ڈالکر سونا چاہتا ہے تو اُلٹا بے چین ہوتا ہے - بلکہ جتنی کوشش کرتا ہے اُتنا ہی بے چین ہوتا ہے - ایک شخص اثنائے گفتگو میں کسی کا نام بھول جاتا ہے اب جب تک وہ یہ کہتا رہتا ہے کہ "دیکھئے صاحب مجھے اُن کا نام بھول گیا ہے - یاد ہی نہیں آتا" یقیناً اسے کبھی وہ نام یاد نہیں آئیگا - مگر جب اس نے برخلاف اسکے یہ کہنا شروع کیا کہ "دیکھئے میں ابھی اُن کا نام بتاتا ہوں - مجھے ابھی یاد آیا جاتا ہے" تو فوراً بغیر کسی کوشش کے بھولا ہوا نام یاد آجائیگا -

بائیسکل کے نو آموز خوب واقف ہونگے - نو آموز کیا کہنہ مشقوں کا بھی یہ تجربہ ہے کہ وہ بائیسکل کا ہینڈل خوب مضبوط

تھامے جا رہے ہیں مگر خوف یہ ہے کہ کہیں گر نہ پڑیں۔ راہ میں کوئی معمولی سی روک آجاتی ہے تو وہ ضرور اس سے ٹکرا جاتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔

ہم میں سے کون ہے جس پر "بے اختیارانہ ہنسی" کا دورہ طاری نہیں ہوا۔ کسی وجہ سے ہم ہنس پڑے اور اتنا ہنسے کہ بے اختیار ہو گئے۔ اب دیکھئے:۔

(۱) تختہ پر چلنے والا شخص۔ (۲) مریض بے خوابی۔ (۳) وہ شخص جسے کسی کا نام بھول گیا ہے۔

(۴) سائیکل سوار۔ (۵) بے اختیارانہ ہنسنے والا۔

پانچ مختلف حالتیں ہیں۔ جس میں "ارادہ" اور "واہمہ" دونوں کام کر رہے ہیں۔ اور ان کی کیفیت علی الترتیب یہ ہے:۔

ارادہ		واہمہ
(۱) میں گرنا تو نہیں چاہتا	مگر	گر پڑوں گا۔
(۲) میں سونا چاہتا ہوں	مگر	سو نہیں سکتا۔
(۳) بھولا ہوا نام یاد کرنا چاہتا ہوں	مگر	یاد نہیں آتا
(۴) رکاوٹ سے بچنا تو چاہتا ہوں	مگر	گر پڑوں گا
(۵) ہنسی روکنا تو چاہتا ہوں	مگر	کیا کروں رکتی ہی نہیں۔

آپ نے دیکھا ہر حالت میں "وہم"، "ارادے" پر غالب آیا۔ شراب کے عادی سے دریافت کیجئے۔ پان میں تمباکو کھانے والے سے پوچھئے۔ وہ کہیں گے دل تو چاہتا ہے چھوڑ دیں۔ مگر کمبخت یہ عادت چھٹتی ہی نہیں۔ متعدد مجرموں سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ وہ اس جرم کے کیوں مرتکب ہوئے تو انہوں نے کہا کہ برخلاف ان کے "ارادے" کے کسی ایسی طاقت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ایسا کریں۔ اور ان لوگوں کا کہنا بالکل بجا اور درست ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کا "واہمہ" یہی کہتا ہے کہ "وہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہ سکتے"۔

اب دیکھئے کہ "ارادے" اور "قوتِ ارادی" پر ہمیں کتنا فخر و ناز تھا۔ اور اسی کے بل بوتے پر ہم کہتے یہ تھے کہ ہم مطلق العنان ہیں۔ جو جی چاہے کر سکتے ہیں۔ اور جس طرح چاہے سوچ سکتے ہیں۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ ہم "واہمہ" کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی ہیں ہمارے تمام خیالات اور تمام احساسات کی باگ ڈور "واہمہ" کے دستِ قدرت میں ہے۔ تو گویا اگر ہم اپنے "واہمہ" کو اپنے قابو میں رکھیں اور یہ جان لیں کہ اس کی صحیح راہ نمائی کی کیا تدبیر ہے تو ہمارے بہت سے بگڑے ہوئے کام بن سکتے ہیں۔

اب آئیے دیکھیں کہ "اشارۂ نفسی" کیا چیز ہے۔ جس کا ذکر ابتدائی سطروں میں کیا گیا ہے۔ کسی شخص کا کسی خیال کو کسی دوسرے شخص کے دماغ پر وارد کر دینے کا نام "اشارہ" ہے۔ "اشارۂ نفسی" ایک قسم کا عمل مقناطیسی ہے۔ جسے نہایت سادہ الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں، کہ "واہمہ" کے اقتدار کا نام "اشارۂ نفسی" ہے۔ جب تک آپ کسی کام کو آسان

سمجھ رہے ہیں۔ اسکا کرڈالنا آپ کے لئے مشکل نہیں۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیں کہ وہ نہایت دشوار ہے تو یقین جانیئے کہ آپ کبھی نہ کرسکیں گے۔ خفقان اور اختلاج قلب کے مریض اکثر معمولی ہی باتوں سے اس قدر متاثر ہو جایا کرتے ہیں۔ کہ ان کا مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ جس قدر وہ اپنے آپ کو زیادہ بے بس اور مجبور خیال کرتے ہیں اسی قدر وہ واقعتہً ہوتے بھی جاتے ہیں۔ چوٹ لگ جانے پر خواہ وہ کیسی ہی معمولی ہو جب تک یہ خیال کرتے جائیں گے کہ یہ بہت زیادہ ہے اور نہایت تکلیف دہ ہے تو وہ ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ مگر اس کے برعکس اگر ہم اسکو اہمیت نہ دیں تو تکلیف ہم کو محسوس ہی نہ ہو۔ ہر شخص کو یقیناً اس بات کا تجربہ ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب کوئی حادثہ پیش آیا تو وہ اچھے بھلے بیٹھے رہے۔ مگر جونہی کسی نے کہا۔ "اوہو! دیکھئے خون بہ رہا ہے"۔ تو ان کو فوراً غش آگیا۔ بچے کھیلتے کھیلتے گر پڑتے ہیں اور اٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں۔ مگر جہاں کہیں کوئی دوسرا شخص ان کی طرف متوجہ ہوا اور اظہار ہمدردی کے طور پر کچھ کہدیا تو وہ فوراً رونے لگتے ہیں۔

بعض مرتبہ لوگ یوں بھی کہا کرتے ہیں کہ انھیں چاندنی یا اندھیری میں یا طلوع وغروب یا کسوف وخسوف کے وقت دردِ سر یا فلاں مرض کا دورہ پڑتا ہے تو وہ ہمیشہ اس وقت کے منتظر رہتے ہیں اور ٹھیک اسی وقت وہ اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام مثالیں "اقتدار واہمہ" کی ہیں۔

ڈاکٹر کی یو مذہب اشارہ کے موجد مانے گئے ہیں۔ مگر عہد حاضر میں منجملہ اور بڑے بڑے نامور ڈاکٹروں کے جن کا ذکر میں بعد کو کروں گا "ڈاکٹر ایمل کو" بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ "اشارہ نفسی" کے مخترع آپ ہی ہیں اور ان دنوں آپ فرانس میں بمقام نانسی اقامت پذیر ہیں۔ اور گذشتہ تقریباً نصف صدی سے "اشارہ نفسی" کے علمی اور عملی پہلوؤں پر غور کر رہے ہیں۔ اپنے ہزاروں تجربات سے انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ "واہمہ" کا ہمارے تمام جسم اور جسمانی کیفیات پر کتنا زبردست اثر ہوتا ہے۔ انہوں نے اس عرصہ میں ہزارہا ایسے مریضوں کو جنہیں یوروپ کے نامی معالجان خصوصی نے لاعلاج قرار دیدیا تھا۔ بغیر کسی دوا یا آپریشن کے محض "اشارہ نفسی" کے عمل سے تندرست کردیا۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں:۔

"ہر مرض خواہ وہ کیسا ہی ہو "اشارہ نفسی" سے دور کیا جاسکتا ہے"۔ "اشارہ نفسی" ایک ایسا آلہ ہے جو انسان کا پیدائشی ورثہ ہے۔ اور جس سے ہم تمام عمر بے شعورانہ کھیلتے رہتے ہیں۔ "اشارہ نفسی" ہماری ایک قوت پنہاں ہے جو ہمیں اپنے آپ پر پورا اقتدار حاصل کرنا بتاتی ہے۔ اس سے ہم اپنے آپکو اور دوسروں کو جسمانی اور دماغی امراض سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اور اپنے ہی ماحول میں رہ کر مسرت وانبساط سے زندگی بسر کرنیکا طریقہ بتا سکتے ہیں۔ جن اعمال کو تم معجزات سمجھتے ہو در اصل ان کی پشت پر خالص فطرتی اسباب موجود ہیں اگر وہ تمہیں متحیر کرتے ہیں تو اسکی یہ وجہ ہے کہ تم نے "سبب" کو نہیں پایا۔ جب تمہیں سبب معلوم ہوگا تو سمجھو گے کہ اس سے زیادہ قدرتی فعل اور ہو ہی کیا سکتا تھا"۔

"اشیاء ہمارے لئے وہ نہیں ہیں جو در اصل وہ ہیں۔ بلکہ وہ ہیں جو ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہماری تشکیل ہمارے اپنے دست قدرت میں ہے۔ نہ کہ واقعات ماحول کے ہاتھ میں۔ "اشارہ نفسی" جو یقین کے ساتھ پیہم عمل میں لایا جائے۔

لہٰذا سانہ صحت کیسا تہ نتائج پیدا کرتا ہے"۔

ڈاکٹر پال جائر فرماتے ہیں۔ کہ عمل مقناطیسی بیشک ہمارے اعصاب کی وساطت سے عمل پذیر ہوتا ہے۔ مگر اعصاب تو ہمارے تمام اعضاء جوارح پر قابو پائے ہوئے ہیں۔ اعصاب ہی اعضاء کو متحرک کرتے ہیں۔ اور اعصاب ہی براہ راست دل کے دورانِ خون اور عروق و شرائین کی بست و کشاد کو ایک ضابطہ میں رکھے ہوئے ہیں۔

بلجیم کے مایۂ ناز پروفیسر ایمرائی نولز فرماتے ہیں:۔

"انسان میں امراض کی مدافعت کے لئے ایک قوت خود اس کے اپنے ہی اندر مخفی موجود ہے اور اشارہ نفسی پر اقتدار حاصل کرنے اور اسے مناسب طور پر استعمال کرنے سے ہم امراض کے ہر حملے کو رفع کر سکتے ہیں"۔ پروفیسر مذکور پھر فرماتے ہیں۔ "یہ ثابت ہو چکا ہے کہ "اشارۂ نفسی" کے باقاعدہ اور باضابطہ اعمال سے انسان ہر جسمانی درد و کرب سے نجات پا سکتا ہے۔ اور وہ تمام کمزوریاں اور بے قاعدگیاں جو انسان کو مائل بہ تنزل رکھنے کے باعث انسانیت کو قعر مذلت میں ڈالنے کا موجب ہو رہی ہیں" اشارۂ نفسی" سے اس طرح نابود کی جا سکتی ہیں کہ کبھی تھیں ہی نہیں"۔

"پریکٹیکل سائیکالوجی" کے فاضل مسٹر لے میڈکش ایک لیکچر کے دوران میں فرماتے ہیں" ہر اس شخص کے پاس جو اس شعبۂ حکمت کا عملی علم رکھتا ہو صحت کا پورا خزانہ موجود ہے۔ آج کسی شخص کے لئے بیمار رہنے کا سوائے حادثات کے اور کوئی بہانہ نہیں ہے۔ اور یہ وہ رائے ہے۔ جس کی تائید تمام طبی دنیا نے کی ہے۔ جب یہ علم اس قدر وسیع ہو جائیگا کہ ہر شخص اس سے متمتع ہو سکے تو امراض نابود ہو جائیں گے۔

الغرض "اشارۂ نفسی" عجیب چیز ہے۔ جسمانی کمزوریاں اور صحت کی خرابیاں اس عمل سے مکمل طور پر رفع ہو سکتی ہیں بچوں اور بڑوں کی تمام ایسی عادتیں جن کے متعلق ہمارے تمدن اور معاشرت نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ جامۂ انسانیت پر ایک بدنما داغ ہیں اشارۂ نفسی سے سدھر سکتی ہیں۔ وہ ذلیل اعمال و اشغال جنہیں بنی نوع انسان کے متمدن ممالک کا کوئی باشندہ مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ اشارۂ نفسی کی تدریجی تدابیر سے رفتہ رفتہ نیست و نابود کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر داشے کہتا ہے کہ صرف "تنظیف واہمہ" سے ہر دو اس قابل ہو سکتی ہے کہ وہ دماغی اور جسمانی تکالیف کا استیصال کردے"۔ اس عمل سے مستفید ہونیکا طریقہ بیان کرنے سے پہلے اسکی وقعت ذہن نشین کرا دینا نہایت ضروری ہے۔

موسیو جان بیزیئے پیرس میں شعبۂ زراعت کے انجینئر تھے۔ مگر آپ نے اپنے مقناطیسی اعمال میں ملکہ حاصل کر کے شعبۂ زراعت کو خیرباد کہہ دیا اور اشارۂ نفسی سے علاج کرنا شروع کیا۔ اس میں انھیں اس درجہ کامیابی حاصل ہوئی کہ ان کے ہمعصر حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور ان پر مقدمہ چلا دیا۔ مگر جب عدالت گاہ میں بھی انہوں نے اپنے طریق علاج کو عین فطرت کے مطابق ثابت کر دیا تو عدالت کچھ نہ کر سکی۔

پروفیسر الیگزینڈر ارسکن۔ یہ انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور باوجود خاندانی مخالفت اور اس

نفرت کے جو پیشہ طبابت کو علم نفسیات سے ہے - انہوں نے اعمال مقناطیسی کی طرف توجہ کی - اور ان کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے بڑے بڑے متعصب طبیب و جراح کئی مرتبہ ان کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں - اگرچہ انہوں نے کہیں باقاعدہ تعلیم کسی ادارۂ طب و جراحت میں حاصل نہیں کی - مگر آپ انگلستان کے بڑے بڑے شفاخانوں میں معالجہ کے لئے طلب کئے گئے ہیں -

پروفیسر آٹو آٹو برلن - آپ کے طریقۂ علاج نے بارہا وسطِ یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھوم مچا دی - آپ کی علاج گاہ شہر برلن میں ہمیشہ مضطربانِ درد و اندوہ کے لئے کنج عافیت و آسائش رہی ہے - پروفیسر صاحب کا شفاخانہ گویا راحت و سکون کا گھر تھا - جہاں نہ دوا کو دخل نہ نشتر کو - خستۂ اعصاب مزمن امراض اور ہر طرح کی تکالیف سے شکستہ دل مریض باتوں باتوں میں بھلے چنگے ہو جاتے ہیں -

ڈاکٹر چارلس بوڈوین مصنف "اشارہ و اشارۂ نفسی" اور امریکہ کے ڈاکٹر چارلس ایف وینگر پی - ایچ - ایم مصنف "قانون و اعمال اشارہ" کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں - لیکن پروفیسر ایمل کو اس باب میں خاص امتیاز حاصل ہے - بس یوں سمجھئے کہ معجزۂ مسیح ۱۹۰۰ سال بعد پھر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے - پروفیسر موصوف عوام الناس کو بہترین انسان بنانے میں جس تن دہی اور خلوص سے کام لے رہے ہیں اس کی مثال صفحۂ ہستی پر ملنا دشوار ہے - ہر طبقہ کے لوگ ہر پیشہ کے انسان - ڈاکٹر اور فلسفی سے لیکر مزدور تک اس کے پاس مضطرب الحال جاتے ہیں اور مطمئن ہو کر آتے ہیں - معجزہ - سحر - جادو ان کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں رہی - ایک مریض وجع المفاصل کا آتا ہے - جھکا ہوا - گھسٹتا ہوا - دونوں ہاتھوں میں لاٹھیاں تھامے - چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی - اور مطب میں آکر بیٹھ جاتا ہے - جہاں اور بہت سے معذور و مفلوج مریض موجود ہیں - پروفیسر آتا ہے - اور کہتا ہے - گھبراؤ نہیں یہ مرض ابھی دور ہوتا ہے پھر چند ابتدائی اعمال کئے اور کہا اپنی آنکھیں بند کرو - اور منہ سے جلدی جلدی پیہم کہے جاؤ - "یہ مرض جا رہا ہے" "جا رہا ہے" "گیا! گیا!" پھر بیس پچیس سیکنڈ کے بعد خود ہی کہا - دیکھو اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے - اٹھو اور چلو - مریض اٹھا اور چلنے لگا - تیز چلو - اور تیز - اور بھی تیز! تم اچھے بھلے چلنے لگے - اب تم دوڑو گے بھی - لو چلو دوڑو! لیجئے مریض دوڑنے لگا - اور ایسا خوش خوش دوڑنے لگا جیسے پچیس برس کا نوجوان ہو - آدھے منٹ میں ۳۲ سال کا پرانا مرض بات کرتے کرتے رفع ہو گیا - یہ ۲۷ - اپریل ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے - فرمائیے معجزہ اور کسے کہتے ہیں؟

موسیو برنا پراوس اپنے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "اس کی بے لوث ہمدردی اور اخوت اور بنی نوع انسان سے فراوانی محبت کا حال دیکھ کر ناممکن ہے کہ کوئی اس کا گرویدہ نہ ہو جائے - کہتے ہیں کہ "میں اس کے شفاخانہ میں گیا - ہر مرض کے مریض وہاں موجود تھے - مدقوق و مسلول - دمہ کے مریض - ناسوروں میں مبتلا - رسولیوں والے - مبروص اور مفلوج - اور اکثر ان میں ایسے تھے جو طب یا جراحت کے دروازہ سے ناکام ہو کر پھرے تھے -

میں نے ایک مفلوج عورت کو دیکھا۔ جو ایک کرسی پر پڑی تھی موسیو کوؔ تشریف لائے اور اس سے کہا۔ اپنا علاج خود کرنا تو بہ نہایت آسان بات ہے۔ کبھی کسی کو میں نے اچھا نہیں کیا۔ صحت اور تندرستی کی قوت خود تم میں موجود ہے۔ اس سے کام لو۔ صرف اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرو۔ لامتزلزل اعتماد۔ تمہاری سرشت میں تمہارا علاج موجود ہے۔ اسے بیدار کرو۔ تمہاری ہر تکلیف رفع ہو جائیگی۔ سنا تم نے جو میں نے کہا ہے؟ تمہیں یقین ہے کہ تم چل پھر سکوگی"؟ عورت بولی۔ جی ہاں۔ "اچھا تو پھر اٹھو"۔ معاً عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو"! عورت چلنے پھرنے لگی۔ اور باغ میں ٹہلنے لگی۔ الفاظ کیا تھے اشارات برقیہ تھے۔ ایک معجزہ تھا کہ میرے دیکھتے دیکھتے ظہور میں آیا۔"

بداعتقادی میرے خیال میں جرم نہیں ہے۔ تمام محققین بداعتقاد ہوا کرتے ہیں۔ اس مضمون کے قارئین بھی اکثر بدگمان ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں پروفیسر کوؔ کے الفاظ ہی دہراتا ہوں۔ جو انہوں نے پیرس کے ایک مجمع کے روبرو فرمائے تھے:۔

"اگر آپ میں سے کچھ ایسے ہیں جو منکرین و متشککین ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ضرور ہیں۔ تو میں ان سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے مطب میں آئیے اور خود دیکھئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ حقیقت کو دیکھ کر منکر نہیں رہ سکتے۔"

محمد عطاء اللہ بسمل

نگار کے گذشتہ سالوں کے پرچے حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء ستمبر ۳ر۔ اکتوبر ۸ر۔ سنہ ۲۴ء جنوری ۸ر۔ فروری ۸ر مارچ ۸ر اپریل ۸ر مئی ۸ر
اگست ۸ر سنہ ۲۶ء جنوری ۸ر۔ مئی ۳ر۔ جون ۳ر اکتوبر ۳ر نومبر ۳ر دسمبر ۸ر سنہ ۲۷ء
مارچ ۳ر اپریل ۶ر مئی ۳ر جون ۳ر دسمبر ۸ر سنہ ۲۸ء سنہ ۳۰ء مارچ ۸ر مئی ۶ر
ستمبر ۸ر اکتوبر ۸ر نومبر ۸ر سنہ ۳۱ء جولائی ۸ر اگست ۸ر ستمبر ۸ر اکتوبر ۸ر نومبر ۸ر
دسمبر ۸ر سنہ ۳۳ء جنوری ۱۲ر فروری ۸ر مئی ۸ر جولائی ۶ر ستمبر ۸ر اکتوبر ۶ر دسمبر ۸ر
سنہ ۳۴ء فروری ۸ر مارچ ۸ر اپریل ۸ر مئی ۸ر جون ۸ر جولائی ۸ر ستمبر ۸ر اکتوبر ۸ر

دو روپیہ یا اس سے زیادہ قیمت کے پرچے وی پی کے ذریعہ سے بھی بھیجے جا سکتے ہیں اس سے کم کیلئے پیشگی رقم ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر وصول ہونا ضروری ہے۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فائل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں۔ علاوہ محصول۔ مینجر نگار لکھنؤ

مصطفےٰ کمال اور جنگِ عظیم

(بسلسلہ ماسبق)

جس وقت انور نے دوبارہ اورنہ پر قبضہ کیا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال بھی فوجی اسٹاف میں لفٹنٹ کرنل کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ لیکن انور کی کامیابی نے اسکو پسِ پشت ڈالدیا تھا اور لوگوں کی نگاہیں اس پر بہت کم پڑتی تھیں۔

یہ پھر قسطنطنیہ چلا گیا اور یہاں اپنی ماں اور بہن کیساتھ خاموش و بے مزہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہر چند وہ انور کی برسرِ اقتدار جماعت کو بہ لحاظِ سیاست بہت پست سمجھتا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا ستارہ عروج پر تھا اور جدید حکومت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اس لئے پرانے ساتھیوں نے بھی اسکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس وقت طلعت و جمال وزراء کابینہ تھے۔ اور انور وزیر جنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے ایک شاہزادی سے شادی کرلی تھی۔ اور آبنائے باسفورس پر ایک محل میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ انور چاہتا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو خلافت کے ماتحت ایک شیرازہ سے وابستہ کردے اور تمام ترکی بولنے والی قوموں کو حکومت ترکی سے متعلق کرکے سلطنتِ عثمانی کے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لے آئے۔ مغربی سلطنتوں میں صرف جرمنی ایک ملک ایسا تھا جو ترکی کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ ورنہ اور تمام ممالک سے تعلقات اچھے نہ تھے۔

مصطفےٰ کمال اس وقت ایک جونیئر افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اپنی فطری خشونت کی وجہ سے انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں میں بھی مقبول نہ تھا۔ انور سے وہ بارہا لڑ چکا تھا۔ لیکن جمال ضرور اسکا معترف تھا۔ اور غالباً اس لئے کہ اس کی طرح مصطفےٰ کمال بھی جرمنی سے متنفر تھا۔

اورنہ پر قابض ہونے کے بعد انور نے سب سے پہلے فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس نے اس کام کے لئے ایک جرمن جنرل لیمان سانڈرس کی خدمات حاصل کیں۔ یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال کے بدن میں آگ لگ گئی۔ اور علی الاعلان اس نے مخالفت شروع کردی۔ ایک دن اس نے فوجی افسروں کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اہلِ جرمن کو فوج میں درخور کا موقعہ دینا اول درجہ کی حماقت ہے۔ اور ترکی قوم کی توہین اس سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتی کہ اسکی فوج کا انتظام دوسروں کے ہاتھ میں ہو" اس نے جمال سے ملکر بھی گفتگو کی۔ لیکن انور نے تو کوئی بات ہی نہیں کی اور اسکو سفارت صوفیہ میں فوجی

کا نائب بناکر بھیجدیا۔

یہاں آئے ہوئے اسکو تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا کہ سرویا کا آرک ڈیوک قتل کیا گیا اور جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جس میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

مصطفےٰ کمال کے اضطراب و غصہ کا اس وقت عجیب عالم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ترکی نے جرمنی کا حلیف بننے میں سخت غلطی کی ہے اور فائدہ صرف غیر جانبدار رہنے میں تھا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ اور نتیجہ کا منتظر تھا۔

مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ جنگ چند ہفتوں میں ختم ہو جائیگی۔ لیکن جب ہفتوں پر ہفتے گذرتے گئے اور لڑائی کی آگ زیادہ مشتعل ہوئی تو یہ بے اختیار ہو گیا اور اس نے انور کو تار دیا کہ جنگ میں شرکت کی اجازت دیجائے۔ لیکن انور نے اسکو وہاں سے نہ ہٹایا۔ اس کے بعد اس نے متعدد تار دیئے۔ خطوط لکھے۔ اپنے احباب کو بیچ میں ڈالا۔ لیکن انور نے ایک نہ سنی۔ اور اسکو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ جب مہینوں پر مہینے اسی طرح گذر گئے تو فروری ۱۹۱۵ء میں ——— اس نے ارادہ کر لیا کہ بغیر اجازت ہی نکل پڑنا چاہیے۔ اور وہ اسباب سفر درست کر ہی رہا تھا کہ قسطنطنیہ سے طلبی کا تار آیا۔ صورت یہ ہوئی کہ جب انور پاشا روس کے خلاف کوہ قاف میں جنگ کرنے کے لئے چلا گیا تو حقی پاشا اسکا انچارج ہوا۔ اسکو ضرورت تھی افسروں کی۔ اور انور پاشا کی ذاتی مخالفت سے اسے کوئی بحث نہ تھی۔ اس لئے اس نے فوراً مصطفےٰ کمال کو طلب کر لیا۔ کہ وہ بہترین فوجی افسر سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت تک انگریزی بیڑے دوبار درہ دانیال پر حملہ کر چکے تھے اور مصر میں گیلی پولی پر حملہ کرنے کے لئے زبردست فوجی اجتماع کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ جس وقت مصطفےٰ کمال قسطنطنیہ پہنچا اسی وقت درہ دانیال کے محاذ پر اسکو بھیجدیا گیا۔ جہاں کی کمان لیمان آن سانڈرس (جرمن) کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے گیلی پولی کے جنوبی حصہ کی کمان مصطفےٰ کمال کے سپرد کر دی۔ سانڈرس کی رائے ترکی افسروں کی نسبت کچھ اچھی نہ تھی لیکن مصطفےٰ کمال کے متعلق وہ دوسری رائے رکھتا تھا، ہر چند وہ سمجھتا تھا کہ مصطفےٰ کمال خود رائے اور ضرورت سے زیادہ بیباک و آزاد ہے لیکن اسکی محاربانہ قابلیت اور جرأت و دلیری کا معترف تھا۔

ایک مرتبہ تو مصطفےٰ کمال نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ ترکی کا غیر جانبدار رہنا بہتر تھا۔ کیونکہ جرمنی کی کامیابی اس جنگ میں بہت مشتبہ ہے۔ لیکن سانڈرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر چند ان دونوں کی رائے میں اکثر اختلاف ہوا کرتا تھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ ضدی واقع ہوئے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے قدرداں تھے۔

اب قاہرہ و یونان سے خبریں آنے لگیں کہ ۸۰ ہزار انگریزی سپاہ مصر میں مجتمع ہو گئی ہے۔ اور ایک بیڑے کی معیت میں جلد حملہ کرنے والی ہے۔ سانڈرس کافی پریشان تھا کیونکہ گیلی پولی کے ۵۲ میل کے محاذ کی حفاظت او

ہر جگہ فوج کا جمع رکھنا دشوار تھا۔ ملک پہاڑی تھا اور متعدد مقامات انگریزوں کے قبضہ میں جا چکے تھے۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ۲۵ میل کے محاذ میں کس خاص جگہ سے حملہ شروع ہوگا۔ اس وقت ترکی فوج ۶ ہزار تھی۔ اس نے اس کے تین حصے کر کے تمام محاذ پر پھیلا دیا اور خاموشی کیساتھ حملہ کا انتظار کرنے لگا۔

اسی دوران میں انور بے روس سے قسطنطنیہ واپس آیا۔ اور اس نے حکم بھیجا کہ مصطفیٰ کمال کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ سانڈرس مجبور ہوگیا اور نہایت افسوس کیساتھ انیسویں ڈویژن کی کمان اس کے سپرد کر دی جو میڈوس میں بطور محفوظ فوج کے خیمہ زن تھی۔ سانڈرس نے مصطفیٰ کمال کو چلتے وقت ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی فوج سے نہایت احتیاط کیساتھ کام لے اور جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ انگریزی فوج کا مرکزی حملہ کس جگہ ہے۔ اسکو حرکت میں نہ لائے۔

مصطفیٰ کمال ہر چند انور کے اس حکم سے نہایت برہم تھا۔ لیکن اس خیال سے ضرور مطمئن تھا کہ سانڈرس اس پر اعتماد رکھتا ہے۔ جب یہ میڈوس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ فوج ایک ترکی اور دو عربی رجمنٹوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اسکی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس نے فوج کی درستی و تنظیم پر توجہ کی۔ اور چند ہفتوں کی محنت سے اس کو ایک باقاعدہ و منظم صورت میں لے آیا۔ اسی کے ساتھ اس نے گھوم پھر کر اس حصۂ زمین کا بھی کافی مطالعہ کیا جہاں اسے اپنی فوج کو نقل و حرکت دینا تھی۔

۲۵۔ اپریل کو انگریزی حملہ شروع ہوا۔ سمندر پر ہلکا سا کہر پھیلا ہوا تھا کہ اس دھند لکے سے بیڑا نمودار ہوا۔ اور انگریزی فوج کے ایک حصہ نے شمال کی طرف بولیر پر حملہ کر دیا اور دوسرے حصہ نے جنوب کی طرف۔ لیکن یہ دونوں حملے صرف دھوکا دینے کے لئے تھے۔ تاکہ سانڈرس کو اصل مرکزی حملہ کا پتہ نہ چلے اور سانڈرس واقعی دھوکہ میں آگیا۔

مرکزی حملہ کا مقام فی الاصل گابا تیپ تھا۔ تاکہ یہاں سے وادی میڈوس ہوتے ہوئے چوناق بیر کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا جائے۔ (جہاں مصطفیٰ کمال خیمہ زن تھا۔) جو اس محاذ کی کنجی تھی۔ لیکن اتفاق سے سمندر کے تموج نے جہازوں کو ذرا اور آگے بڑھا دیا اور فوجوں کو اری برنو پر اترنا پڑا۔ جو چوناق بیر پہاڑی کے بالکل دامن میں واقع تھا۔

مصطفیٰ کمال کو اسکا مطلقاً علم نہ تھا اور وہ حسب معمول صبح ساڑھے پانچ بجے اپنی فوج کی پریڈ میں مصروف تھا کہ اس نے ترکی فوج کے ایک دستہ کو پہاڑی کے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ "کیا قصہ ہے؟" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا کہ "انگریزی فوج خشکی پر اتر آئی ہے"۔ مصطفیٰ کمال نے پوچھا "کس مقام پر اتری ہے"؟ جواب ملا کہ "اری برنو پر"۔ یہ سنتے ہی حکم دیا کہ "سنگینیں لگا لو اور واپس جاؤ"۔

چند منٹ میں نویں ڈویژن سے جو اس کے داہنی جانب تھی اس خبر کی تصدیق ہوئی۔ مصطفیٰ کمال نے تھوڑی دیر تک غور کیا اور جو کچھ کرنا تھا اسکا فیصلہ کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ سانڈرس کا یہ خیال کہ انگریزی فوج کا مرکزی حملہ بلیر پر ہوگا درست نہیں ہے۔ بلکہ حملہ کا پورا زور چوناق بیر پر ہوگا۔ اس لئے اس نے حکم کا انتظار کئے بغیر مصمم ارادہ کر لیا کہ چوناق بیر کو بچانے

کے لئے وہ اپنی ساری کوشش صرف کردیگا۔

اُس نے فوج سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ "کارتوس خالی ہیں یا ان میں گولی بھری ہوئی ہے"۔

سپاہیوں نے جواب دیا کہ "گولیاں بھری ہیں"۔

مصطفےٰ کمال نے کہا کہ "فوراً چوناق بیر کی طرف بڑھنا شروع کردو"۔

اس کے پاس اس وقت ایک معمولی سا نقشہ تھا۔ جس میں اری بر نو کا نام بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک ہاتھ میں اسی نقشہ کو لیا اور دوسرے ہاتھ میں کمپاس اور صرف دو سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر گھوڑا بڑھا دیا۔ زمین بہت ڈھلوان تھی۔ جابجا گڑھے تھے۔ ناہموار پتھروں نے راستہ کو دشوار گذار بنا دیا تھا۔ اس لئے سپاہی اسکا ساتھ بمشکل دے سکتے تھے۔ مگر یہ برابر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور جب پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو صرف چند سپاہی اسکے ساتھ تھے۔ یہاں پہنچکر اس نے نیچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ تو معلوم ہوا کہ ۲۰۰ گز کے فاصلہ سے آسٹریلین فوج کا دستہ بڑھتا چلا آرہا ہے رجمنٹ کا کمانڈر ابھی کچھ پیچھے تھا اور سپاہیوں سے ناہموار راستہ طے کراتا ہوا آرہا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے سب سے سینئر کمانڈر کو بلا کر حکم دیا کہ "جتنے سپاہی فراہم ہوسکتے ہیں ان سب کو اکٹھا کرکے دشمن پر حملہ کردو"۔

رجمنٹ ۷۵ جس وقت اُوپر پہنچی تو بہت خستہ ہوچکی تھی۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے ان کی خستگی کی مطلق پروا نہیں کی۔ اور خود اسکو مرتب کرنا شروع کیا۔ اسی دوران میں توپخانہ بھی پہنچنے لگا۔ اور اس نے سب سے پہلی پہنچنے والی توپ کو خود اپنے ہاتھ سے بلند ترین مقام پر نصب کردیا اور فائر شروع کردیا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال کی حالت ایسی تھی جیسے اس کے جسم میں بجلی دوڑ گئی ہے اور ایک لمحہ کے لئے اسے قرار نہیں ہے۔ اس نے باختیار خود دوسری رجمنٹ کو بھی بلا لیا اور جب وہ ناکافی ثابت ہوئی تو تیسری کو بھی۔ یہاں تک کہ اس نے ساری فوج طلب کرکے حملہ شروع کردیا۔ اور رزرو میں ایک سپاہی بھی باقی نہ رہا۔

اس میں شک نہیں کہ مصطفےٰ کمال یہ سب کچھ باختیار خود بغیر حکم حاصل کئے ہوئے کررہا تھا۔ اور اسکی یہ جسارت نہایت ہی خطرناک تھی۔ کیونکہ اگر مرکزی حملہ کسی اور طرف ہوتا تو پھر اسکا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن واقعات وحالات نے ثابت کردیا کہ مصطفےٰ کمال کا خیال بالکل صحیح تھا۔ اور جو کچھ اس نے کیا بجا و درست تھا۔

تمام دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی رہی۔ اور انگریزی فوج پہاڑ کے دو تہائی حصہ تک پہنچکر رک گئی۔ اب حالت یہ تھی کہ ترک سپاہی بھی تھک کر چور ہوگئے تھے اور دو عربی رجمنٹیں بھی بالکل خستہ و مضمحل نظر آتی تھیں۔ لیکن اُدھر انگریزی فوج کا بھی یہی حال تھا۔ اس لئے جب شام ہوئی تو پہاڑی بدستور ترکوں کے قبضہ میں تھی۔ اور انگریزی فوج اُن سے کچھ نیچے پہاڑی کے ڈھلوان حصہ پر پائی جاتی تھی۔ مصطفےٰ کمال نے رات کیوقت بھی برابر گولہ باری جاری رکھی اور نہ خود چین سے بیٹھا نہ کسی اور کو چین لینے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزی افواج کو ہٹا کر ساحل تک پہنچا دے لیکن اس میں اسکو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

چوناق بیر کی پہاڑی حقیقتاً درۂ دانیال کی کنجی تھی۔ اور درۂ دانیال پر قابض ہوجانا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہوجانا تھا۔ اسی لئے انگریزی فوج چوناق بیر کے لئے جان لڑائے دیتی تھی۔ اور ادھر مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ اگر دشمن اس میں کامیاب ہوگیا تو پھر ترکی کے لئے بجز ہتھیار ڈالدینے کے اور کوئی مفر نہیں ہے۔

جب فریقین میں سے کسی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو دونوں نے خندقیں کھود کھود کر حملہ و حفاظت کی تدبیریں شروع کردیں۔ انگریزی فوج چاہتی تھی کہ جہانتک وہ پہنچ چکی ہے وہاں سے اور آگے بڑھکر پہاڑی پر قبضہ کرلے اور مصطفےٰ کمال یہ عزم کرچکا تھا کہ دشمن کو ایک انچ آگے بڑھنے نہ دیگا۔ بلکہ اسکوپہاڑ کے ساحل آب تک پہنچادیگا۔ آخرکار چند ہفتے اسی حالت میں گذر گئے اور دونوں فریق اپنی اپنی جگہ قایم رہے۔ یہانتک کہ گرمی زیادہ پڑنے لگی۔ پانی کی فراہمی دشوار ہوگئی۔ اور لوگ مرنے لگے۔ لاشیں پڑی ہوئی سڑرہی تھیں۔ مکھیاں بھنبھنارہی تھیں۔ ہیضہ میں سپاہی مبتلا ہورہے تھے۔ اور فریقین کی قوتِ مقابلہ و مدافعت تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ لیکن ان سب میں ایک مصطفےٰ کمال کی ذات ایسی تھی جو بدستور مستعد و آمادۂ کار نظر آتی تھی نہ وہاں خستگی تھی نہ مایوسی۔ نہ اُسے سونے کی ضرورت نہ آرام کرنے کی۔ وہ رات دن نہایت ہوشیاری سے موقع و محل کو جانچتا رہتا تھا۔ اور اسی کے مطابق اپنے اسٹاف کو حکم دیتا رہتا تھا۔ ہر لنگنسٹڑ جرمن افسر جو نویں ڈویژن کا کمانڈر تھا مصطفےٰ کمال کی اس غیر معمولی قابلیت سے حیران تھا۔ اس نے ایک بار کہا کہ "مصطفےٰ کمال کا سا سوچنے والا دماغ میں نے کم دیکھا ہے وہ خود ہی تنہا سوچتا ہے اور خود ہی ایک عزم راسخ کے ساتھ راہِ عمل متعین کرتا ہے۔"

وہ چھوٹے بڑے افسروں سے جاکر خود باتیں کرتا اور براہ راست ان سے معلومات حاصل کرتا۔ بعض اوقات وہ نہایت سخت خطرناک موقعہ پر خود پہنچ جاتا تاکہ دشمن کی پوزیشن کو معلوم کرسکے۔ ایک بار وہ معمولی سارجنٹ کی حیثیت سے لاشیں اٹھانیوالی جماعت میں شامل ہوکر آگے بڑھ گیا۔ تاکہ انگریزی افواج کی خندقوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھے حملوں کے ساتھ کبھی کبھی وہ خود آگے بڑھ جاتا اور یہی وجہ تھی کہ ترکی فوج نے ہمت نہ ہاری اور برابر مقابلہ پر ڈٹی رہی بارہا ایسا ہوا کہ چاروں طرف بندوقوں اور توپوں کی باڑھ میں وہ گھر گیا اور اس نے کبھی اسکی پروا نہیں کی۔

ایکبار خندق کے باہر وہ بیٹھا ہوا تھا کہ انگریزی توپخانہ نے گولہ باری شروع کردی۔ اور گولے اس کے قریب آآکر پھٹنے لگے۔ اسکے اسٹاف نے کہا کہ آڑ میں چلا جانا چاہئے۔ لیکن اس نے انکار کردیا اور کہا کہ "میں چھپ کر سپاہیوں کے لئے بُری مثال قایم کرنا نہیں چاہتا۔" وہ برابر اسی سکون کیساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ اور گولے اس کے چاروں طرف پھٹتے رہے۔ اتفاق سے اسی وقت دشمن کے توپخانہ نے اپنا ہدف بدل دیا۔ اور مصطفےٰ کمال بچ گیا۔ ایک بار وہ موٹر کار میں گیلی پولی کی طرف جارہا تھا کہ انگریزی ہوائی جہاز نے اس پر بم پھینکنے شروع کردیئے۔ گولے اسکے آگے پیچھے گررہے تھے۔ یہانتک کہ ڈرائیور مرگیا۔ موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ بسا اوقات وہ

رائفل اٹھالیتا۔ اور خندق سے آدھا دھڑ باہر نکال کر دشمن کی فوج میں کسی کو نشانہ بناتا۔ اور قطعی خوف نہ کھاتا کہ مبادا وہ خود نشانہ بن جائے۔ کبھی کبھی کھلی ہوئی خطرہ کی جگہ میں وہ باہر نکل آتا۔ اور نہایت آہستہ آہستہ وہاں سے گذرتا اور اسکی یہی مردانگی و جسارت تھی جو ہر وقت اسکی فوج میں تازہ روح پھونکتی رہتی تھی۔

آخر کار جون میں دشمن کی فوج کا ایک حصہ اسے کمزور نظر آیا۔ اور ۲۸۔ کو اس نے حملہ کی تیاری شروع کردی۔ لیکن اتفاق سے ۲۶۔ کو انور گیلی پولی کا محاذ دیکھنے آیا۔ اور اس نے اس تیاری کا حال سنکر مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ مصطفےٰ کمال کو پہلے اسکی اجازت لینا چاہئے تھی۔ علاوہ اس کے یہ حملہ سوائے اسکے کہ ترک سپاہیوں کی جانوں کو نقصان پہنچائے۔ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مصطفےٰ کمال اس سے قبل اطلاع دے چکا تھا کہ اس نے دشمن کی دو مشین گن چھین لی ہیں۔ لیکن انور کو اسکا یقین نہ تھا۔ اس لئے وہ تمام حالات کی جانچ کرنے کے لئے خود موقعہ پر پہنچ گیا۔

مصطفےٰ کمال کو انور کے اس طرز عمل سے سخت صدمہ پہنچا۔ اور اس نے اپنا استعفاء بھیجدیا۔ لیکن لیمان سانڈرس نے اسکو سمجھا بجھا کر استعفاء واپس کردیا۔ اور انور نے بھی مجبور ہو کر حملہ کی اجازت دیدی۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا۔ اور رجمنٹ ۱۸ء بالکل تباہ ہوگئی۔ مصطفےٰ کمال نے اسکا سبب انور کی مداخلت ظاہر کیا اور انور نے مصطفےٰ کمال کو مورد الزام قرار دیا۔

مصطفےٰ کمال نے پھر استعفاء پیش کردیا۔ اور باوجود سانڈرس کے سمجھانے کے اس نے واپس نہ لیا۔ سانڈرس نے کاظم پاشا (چیف آف اسٹاف) سے کہا کہ وہ مصطفےٰ کمال کو سمجھائے۔ چنانچہ کاظم نے ٹیلیفون پر مصطفےٰ کمال کو بلا کر پوچھا کہ "محاذ کا کیا حال ہے اور اب کیا ارادہ ہے"

مصطفےٰ نے کہا کہ "میں یہاں کی حالت برابر ظاہر کرتا رہا ہوں اور اب صرف ایک تدبیر باقی رہ گئی ہے"

کاظم نے پوچھا "وہ کیا ہے" مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ "تمام فوج میری کمان میں دیدیجائے"

کاظم نے کہا "لیکن یہ تمہارے لئے زیادہ تو نہ ہوگی" مصطفےٰ کمال نے کہا "یہ بہت کم ہے" اور یہ کہکر ٹیلیفون کا آلہ رکھدیا۔ آخر کار سانڈرس نے بہت کچھ کہہ سنکر مصطفےٰ کمال کو راضی کیا۔ اب انور بھی قسطنطنیہ واپس جاچکا تھا۔

اخیر جولائی تک یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ انگریزی فوج ایک بڑے حملہ کی تیاری کررہی ہے۔ کیونکہ جزائر یونان و مصر کی طرف سے تازہ دم فوجوں اور سامان حرب کی روانگی کی خبریں ترکوں کو پہنچ رہی تھیں۔ ادھر ترکوں نے بھی امکان بھر تیاریاں شروع کردیں۔ اس حملہ کا مقصد یہ تھا کہ خوجہ چمن والی چوٹی پر قبضہ کرلیا جائے۔ یہ چوٹی چوناق بیر کے شمال میں واقع تھی۔ اور مصطفےٰ کمال کی داہنی خندقوں کی دسترس سے دور تھی۔ اس چوٹی پر قابض ہوجانے کے معنی یہ تھے کہ ترکوں کے حملہ سے محفوظ رہ کر دردانیال پر قبضہ ہوجاتا۔ انگریزی فوج کے کمانڈر نے یہ تدبیر کی کہ آسٹریلین فوج کو بائیں جانب سے سیدھا خوجہ چمن کی طرف روانہ کیا۔ اور ۲۵ ہزار فوج ساحل سے پانچ میل آگے بڑھا کر حکم دیا کہ دونوں طرف سے

بیک وقت حملہ شروع کر دیا جائے اور چوٹی پر پہنچکر دونوں فوجیں مل جائیں۔

برابر ایک ہفتہ سے روز رات کو خفیہ طور پر فوجیں آ آ کر خندقوں میں چھپتی جارہی تھیں۔ اور مصطفےٰ کمال اس تمام نقل و حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

آخر کار ۶۔ اگست کی تاریک رات میں حملہ شروع ہو گیا۔ اور ۱۶ ہزار آسٹریلین سپاہ آگے بڑھنے لگی۔ صبح تک اس کو چوٹی تک پہنچ جانا تھا۔

سانڈرس نے داہنی طرف سے کنتھیسر کی کمان میں نویں ڈویژن کو روانہ کیا۔ جو ساڑھے چار بجے صبح تک چوٹی پر پہنچ گیا۔ جب کچھ روشنی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ دشمن کی فوجیں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی آرہی ہیں۔ کنتھیسر کے پاس اس وقت صرف ۲۰ سپاہی تھے۔ لیکن اس نے فیر کا حکم دیا۔ دشمن نے یہ سمجھ کر کہ ترکوں کی کافی فوج چوٹی پر پہنچ چکی ہے۔ اپنے قدم روک لئے۔ اور خندق بنا بنا کر اپنی حفاظت میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف سے مصطفےٰ کمال اپنی فوج لیکر بڑھا۔ علاوہ اس کے سانڈرس نے بیلڈوس اور بلیر کی طرف سے بھی تمام محفوظ فوج اسی طرف روانہ کر دی۔

۷۔ اگست تک انگریزی فوجیں آرام کرتی رہیں۔ اور ۸۔ کو حملہ شروع کیا۔ حملہ کی صورت یہ تھی کہ میمنہ خوجہ چمن کی طرف بڑھا۔ میسرہ چونوق بیر کی طرف اور مرکزی حصہ پہاڑی کے اس درمیانی حصہ کی طرف جو دونوں چوٹیوں کو ملا رہا تھا۔ ترکوں کی طرف سے بھی پوری مدافعت کی گئی۔ اور مصطفےٰ کمال نے بہت کوشش کی کہ نیوزیلینڈ کی فوج کو جو اس کے سامنے بڑھ رہی تھی پسپا کر دے۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

شام کو سانڈرس نے مصطفےٰ کمال کو بلا بھیجا۔ وہ نہایت برہم تھا۔ کیونکہ بلیر سے جن فوجوں کو طلب کیا گیا تھا وہ اب تک نہیں پہنچی تھیں۔ اور اسی خطا پر اس نے ان کے کمانڈر فوزی بے کو علیحدہ کر دیا تھا۔ تار پر تار اور ٹیلیفون پر ٹیلیفون دیئے لیکن فوجیں فراہم نہ ہو سکیں۔ اس نے مصطفےٰ کمال سے کہا کہ "میں تمام فوجوں کو اب ایک جگہ کر کے کمان تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ اور ہر چند انگریزی فوج تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن جو کچھ ہو مقابلہ کرنا ضروری ہے۔" مصطفےٰ کمال نے فوراً اسکو منظور کر لیا۔ اور دیوانہ وار فوج کی ترتیب و تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ حسن اتفاق سے بلیر سے آنے والی فوجیں بھی اسی وقت پہنچ گئیں۔ اور بہت تھوڑا سا آرام دینے کے بعد مصطفےٰ کمال نے انھیں محاذ پر بھیجدیا۔

۹۔ کی صبح کو انگریزی اور ترکی فوج دونوں کا تصادم ہوا۔ اور باوجود کثیر نقصان برداشت کرنے کے انگریزی فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ چونوق بیر اور خوجہ چمن کی طرف بھی فریقین مصروف پیکار رہے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

انیسویں ڈویژن کے کمانڈر نے مصطفےٰ کمال کو ٹیلیفون دیا کہ انگریزی فوج کی گولہ باری نے ہماری فوج کو بہت بددل کر دیا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ انتشار پیدا ہو جائے۔ مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ جس طرح ممکن ہو ہم ۲ گھنٹہ اور کام

چلاؤ ۔ میں یہاں کا انتظام کرکے خود آتا ہوں ۔"

آخرکار ۸ بجے رات کو وہ خود چونوق بیر پہنچ گیا ۔ اور اس نے گولہ باری کا کوئی خیال نہ کرکے خود دشمن کی پوزیشن کی جانچ کی ۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر نیوزی لینڈ کی فوج کو یہاں سے نہ ہٹایا گیا تو میدان ہاتھ سے نکل جائیگا ۔ اس نے ساری رات تیاری میں صرف کردی اور تمام سپاہ کو جمع کرکے کہا کہ "میرے دوستو گھبراؤ نہیں ۔ اور جلدی نہ کرو ۔ جس وقت تم میرا ہاتھ اٹھا ہوا دیکھو سنگینیں چڑھا لو اور پھر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ ۔"

مصطفےٰ کمال کی اس تقریر نے ترکی سپاہ میں نئی روح دوڑا دی ۔ اور صبح ہونے سے قبل تمام توپخانوں نے گولہ باری شروع کردی ۔ ٹھیک تین بجے صبح کو مصطفےٰ کمال خندق سے باہر آیا اور آگے بڑھا ۔ انگریزی فوج نے بندوقوں کی باڑھ اس پر سر کی لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا ۔ اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور شیر کی طرح آگے بڑھنے لگا ۔ یہ دیکھتے ہوئے ترکی فوج میں غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا ۔ اور نعرے لگاتی ہوئی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو انگریزی بٹالین تو وہیں کھیت رہیں ۔ اس کے بعد ایک اور رجمنٹ منتشر ہوئی ۔ اور پھر دوسری رجمنٹ کا ایک ایک سپاہی ترکی سنگینوں کا شکار ہوگیا ۔ انگریزی فوج پسپا ہونے لگی ۔ اور چونوق بیر کا پورا محاذ دشمنوں سے صاف ہوگیا ۔ یہ تھا مصطفےٰ کمال کا وہ کارنامہ جس نے جنگِ عظیم میں ترکوں کی آبرو رکھ لی اور جس کی بنا پر دشمن بھی اُسے درۂ دانیال کا ہیرو کہتے ہیں ۔

اس کے بعد تین ماہ تک برابر لڑائیاں جاری رہیں ۔ لیکن دشمن کو نہ درۂ دانیال حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور نہ وہ مصطفےٰ کمال کو اسکی جگہ سے ہٹا سکے ۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں انگریزی فوجیں مجبور ہوکر یہاں سے ہٹ گئیں اور مصطفےٰ کمال بھی قسطنطنیہ واپس گیا ۔

(باقی)

آئندہ مہینہ میں یہ سلسلہ مکمل ہوکر ختم ہو جائے گا ۔

مکتوباتِ نیاز کی بعض ظاہری خصوصیات

۱ ۔ ۲۸ پونڈ کے چکنے کاغذ پر نہایت نفیس چھاپی گئی ہے ۔

۲ ۔ حضرت نیاز کی تازہ ترین تصویر اس میں شامل ہے ۔

۳ ۔ ایک اصلی خط کا بلاک بھی دیدیا گیا ہے ۔

۴ ۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے ۔

منیجر نگار

باب الانتقاد

(مجموعۂ منظومات جناب سیماب اکبرآبادی)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صفحہ ۹۴ پر انقلاب روس کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ جس کا ایک شعر ہے ؎

ہر آبادی کچھ ذراتِ رخشاں کا مجموعہ ہے — ہر کانِ گہر کچھ قطرات نیساں کا اک مرجوعہ ہے

چونکہ سیماب صاحب عربی زبان سے ناواقف ہیں اس لئے "مرجوعہ" کے صحیح معنی پر اُن کی نگاہ نہ تھی۔ "رجع" کے معنی لوٹنے کے ہیں اور اسی لئے "راجع" اس عورت کو کہتے ہیں جو بیوہ ہونے کے بعد اپنے والدین کے گھر لوٹ جائے۔ اور اگر متعدی حالت میں اسکو لایا جائے تو "مرجوع یا مرجوعہ" کے معنی اُس چیز کے ہونگے جو لوٹائی جائے یا واپس کی جائے۔

لیکن عربی میں "مرجوعہ" خط یا رسالہ کے جواب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یا گودنا گدانے کو کہتے ہیں۔

اصل میں کان گہر کو "مرجع" یعنی لوٹنے کی جگہ لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن غلطی یا ناواقفیت سے "مرجوعہ" لکھدیا گیا۔

اسی نظم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وہ سطح زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

معلوم نہیں تن تن کر چلنے والوں کو حوروں سے کیوں تشبیہ دی گئی۔ جبکہ ان کی یہ صفت مذہبی لٹریچر میں کسی جگہ نمایاں نہیں ہے۔ حوروں کو "قاصرات الطرف" بتایا گیا ہے۔ ان کی جوانی کو "کواعب اترابا" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کی پاکیزگی و دوشیزگی کو "در مکنون" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ان کی رفتار کی کوئی خصوصیت کہیں ظاہر نہیں کی گئی۔ تن تن کر چلنے کی تشبیہ عام طور پر طاؤس سے دیجاتی ہے۔ کیونکہ اسکی یہ صفت محسوس و مرئی ہے۔ حوریں نہ اس دُنیا کی چیز ہیں اور نہ اس روئے زمین پر کسی نے ان کو چلتے دیکھا کہ ان کی یہ صفت متعین کی جائے۔ علاوہ اس کے موقعہ تعریض کا ہے اس لئے تشبیہ کسی ایسی چیز سے دینا جو حقیقی معنی میں محاسن کے ظاہر کرنیوالی ہو یوں بھی درست نہیں۔ اس کے بعد کا شعر ہے:۔

وہ جن کے پر تو سے برقِ سینا کی شمعیں جلتی تھیں

اس مصرعہ میں بھی وہی عیب ہے۔ برقِ سینا تو ایک خدائی و متبرک چیز ہے۔ اور اگر کسی کے پرتو سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اسکی توہین و مذمت کیسی۔ درآنحالیکہ مدعا صرف تعریض ہے۔

اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔

زنجیرِ سیاست پاؤں میں تھی اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

اس میں بیان کا عدم توازن ظاہر ہے۔ کیونکہ پاؤں میں زنجیرِ سیاست دکھائی ہے جو حقیقی آہنی زنجیر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور دوسری طرف بارِ سلاسل سے واقعی ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا تھا:۔

پاؤں میں تھی زنجیر گراں اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

زار، شاہنشاہ روس کا حال بیان ہوتا ہے:۔

وہ زار، وہ سلطانِ رشیا جو حکم زنداں دیتا تھا

"جو حکم زنداں دیتا تھا" صحیح نہیں۔ زنداں۔ قید خانہ کو کہتے ہیں۔ نہ کہ قید کو۔ اس لئے محاورہ کے اعتبار سے یا تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "جو قید کا حکم دیتا تھا"۔۔۔ یا۔۔۔ "جو زنداں کا حاکم تھا"۔

سرمایہ دار کی نظم میں ایک جگہ تقسیم دولت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

صاحبِ دولت کو ہے تحدیثِ دولت لازمی نعمتِ مقسوم کا ممنون ہونا چاہیئے

سیماب صاحب نے یہاں "تحدیث" کے معنی فنا ہونے کے لئے ہیں۔ یا تجدید کے۔ درآنحالیکہ "تحدیث" کے معنی صرف بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے ہیں یہ بھی نتیجہ ہے عربی سے ناواقفیت کا۔

اسی بند کی ٹیپ کا پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:۔

عارضی دولت کے غرّے پر نہ یوں مغرور ہو

غرّے پر مغرور ہونا غلط اور محاورہ کے خلاف ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں "دولت پر غرّا نہ کرو۔ دولت پر مغرور نہ ہو۔ لیکن غرّہ پر مغرور نہ ہو صحیح نہیں۔ کیونکہ غرّہ کے معنی خود غرور کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ پر ایک نظم "جبر باغباں" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے پہلے بند میں باغبان نے گلشن سے شکایت کی ہے کہ میں یوں تیری خدمت کرتا ہوں۔ اس اس طرح سینچتا ہوں لیکن تجھے پروا نہیں اس لئے میں تیرے اس ستم سے "مجبورِ انتقال" ہوں وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے بند میں گلشن نے جواب دیا ہے کہ "تیری طرح یہاں بہت آئے چلے گئے"۔ انسان کے اختیار میں اگر موت ہوتی تو وہ غمِ ایام کی تلخی کیوں سہتا اور آخر میں یہ کہ:۔

بے اختیاریوں پہ ہے انسان کا یہ حال بہ جبر و انتداب بہ تخویف خود کشی
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

سیماب صاحب نے مصرعۂ اوّل میں انتداب غالباً بہ معنی ندبہ (ماتم و بکاء) استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انتداب کے معنی وفد یا نائب و قائم مقام بنا لینے کے ہیں۔ اور گریہ و بکاء کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ علاوہ اسکے دوسرے مصرعہ کا اقتضاء یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو بے اختیاری کے منافی ہے۔ درآنحالیکہ سوائے جبر کے اور کوئی لفظ اس مفہوم کا نہیں لایا گیا۔ ندبہ یا تخویف خودکشی تو خود بے اختیاری و مجبوری کو ظاہر کرنیوالے ہیں۔ نہ کہ جبر زیادتی کو

صفحہ ۶۵ پر ایک نظم تنہائی کے عنوان سے مندرج ہے۔ جس کا ایک مصرعہ ہے:۔

اسی اک گوشہ میں کونین سما جاتا ہے

حالانکہ کونین تثنیہ ہے اور اردو میں اسکے لئے فعل جمع کا لانا چاہیئے اور بجائے "سما جاتا ہے" کے "سما جاتے ہیں" لکھنا چاہیئے تھا۔

صفحہ ۷۷ پر عید ناقص کے عنوان سے اظہار خیال کیا گیا ہے جس کا تیسرا شعر یہ ہے:۔

صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تو
اپنا معدہ صاف کرکے مسہل و تبرید سے

معلوم نہیں عید سے قبل مسہل و تبرید کا موقعہ کیونکر مل سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اشارہ روزہ نہ رکھنے کی طرف ہے تو پھر پہلے مصرعہ میں کھانے پینے کی تخصیص صباحِ عید کے لئے بیکار ہو جاتی ہے کیونکہ وہ تو رمضان بھر کھانا کھاتا رہا ہے

صفحہ ۸۶ ۔ نظم "جوشِ انتقام" ۔ پہلا شعر ہے:۔

اُٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزمِ عشرت سے
کہ آرہا ہوں میں صد محشرِ جنوں بردوش

لفظ "بردوش" بالکل غلط و بے محل ہے۔ بزمِ عشرت کے چنگ و رباب اٹھا دینے کا حکم دینا صرف اسی لئے ہوسکتا ہے کہ یا تو آنیوالا خود کوئی بہتر سازِ موسیقی لیکر آرہا ہے یا یہ کہ بجائے نغمہ کے وہ کوئی اور ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی بات کا تعلق دوشِ انسانی سے نہیں ہے۔

چوتھا شعر ہے۔

شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نو ساماں
مغنیّہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

اوّل تو محاورہ کے لحاظ سے بجائے "ختم کر" کے "ختم کرے" کہنا چاہیئے تھا۔ علاوہ اس کے مغنیّہ کا کام فسانہ کہنا نہیں ہے جو اس سے ختم کرایا جاتا ہے۔ اس لئے بجائے "فسانہ" کے ایسا لفظ لانا چاہیئے تھا جو "نغمہ" کے مفہوم کو ظاہر کرتا۔ اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

مجھے جہانِ ریا کی جڑیں ہلانا ہیں
ملا ہے اذنِ تکلّم بہ اقتضائے سروش

جہان کی جڑیں ہلانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جڑیں درخت کی ہلائی جاتی ہیں اور یہ محاورہ مکان کے متعلق بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ لیکن [illegible] عرش تیرا ہی جی [illegible] مسلط ہے۔ اس لئے یہاں [illegible] ہے "یعنی جہانِ تنگ" میں نے غور کیا ہے۔ اس قسم کا مجاز قائم کرنا یہاں مفید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ

بلائی جاسکتی ہے۔ دوسرے مصرع میں متقابلاً صداقت یا اسکا ہم معنی لفظ لانا ضروری تھا۔

صفحہ ۱۴۴ پر " اساس کائنات " کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کائنات کا نظام صرف عشق و محبت پر قائم ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:۔

ہے محبت برہمی دہر کو روکے ہوئے ورنہ تھا اسکا الٹنا از قبیلِ ممکنات

اس شعر میں ایک معنوی نقص ہے اور وہ یہ کہ جب دہر کا الٹ جانا صرف ممکن تھا تو پھر اسکو قائم رکھنا محبت کا کوئی کمال نہیں کہا جاسکتا۔ اگر برہمی دہر کو بجائے ممکن کے لازم ظاہر کیا جاتا تو یہ نقص نہ رہتا۔

اس نظم میں نجات۔ رات۔ جہات وغیرہ کے ہم قافیہ ممکنات۔ اور واردات بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل نادرست ہے۔ قافیہ میں اس قسم کی غلطیاں سیماب صاحب نے بہت کی ہیں۔ اور اس سے قبل جابجا انکا اظہار بھی کر دیا گیا ہے صفحہ ۱۴۲ پر ایک نظم "رنگین تیتری" کے عنوان سے ہے اسکا ایک مصرع ہے:۔

اپنے ہی خاص گُل پر قربان ہونے والی

اس مصرع کا پہلا ٹکڑا بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ تیتری کا کوئی گُل مخصوص نہیں ہے۔ اور اگر " اپنے ہی خاص گُل " سے مراد خود تیتری ہو تو اور زیادہ غلط ہے کیونکہ تیتری ہر پھول پر قربان ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

عصمت کے گلکدے میں پابند دستِ محرم اڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم

پہلا مصرع میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرع سے پہلے کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔

ایک جگہ دو تشبیہیں یہ نظر آتی ہیں:۔

پر بستہ ایک کویل محرومِ رم اک آہو

تیتری کو " پر بستہ " اور " محرومِ رم " کہنا۔ جبکہ وہ ہر وقت پران نظر آتی ہے کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

اسی نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

صد رنگ پھول جس میں پریوں کی زندگی ہے عورت اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے

" اُسی چمن " کا اشارہ کس طرف ہے۔ اسکا پتہ نہ پہلے مصرع سے چلتا ہے نہ نظم کے کسی اور شعر سے۔

صفحہ ۱۵۰ پر ایک شعر ہے:۔

تیرے دل میں ہمت احساس مطلق بھی نہیں تجھ کو پیمانِ وفا کا پاس مطلق بھی نہیں

کیا جانے کیا کرے گا تجھ سے خدا آ الٹیبار ذرے

صفحہ ۵۲ پر شاعر کی بعض خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ:۔

الفاظ بے زبان سے معنی نکالتا ہے

"الفاظ بے زبان" کے معنی نکالنا بے تکی سی بات ہے۔ "معنی" کے لحاظ سے "الفاظ" کی صفت "مہمل" ہونا چاہئے۔ یا "بے زبان" کی رعایت سے "معنی" کے بجائے کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نطق کے معنی پیدا کرتا۔

صفحہ ۵۴ پر ایک جگہ "خُنکی" بسکون نون لکھا ہے۔ حالانکہ بالضم ہونا چاہئے۔

اسی صفحہ میں ایک مصرعہ ہے:۔

جہان ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

اس میں لفظ "بھی" زائد ہے۔ بغیر اس کے معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

صفحہ ۶۲ پر ایک مصرعہ ہے:۔

آہستہ ردائے شب سمٹی ہوئی جاتی تھی

اس میں بجائے آہستہ آہستہ "کے" آہستہ" استعمال کیا گیا ہے اور بجائے "سمٹی جاتی تھی" کے "سمٹی ہوئی جاتی تھی" لکھا ہے۔ اگر "سمٹی" سے مراد خاص قسم کا کپڑا ہے جسے "سمٹی" کہتے ہیں۔ تو یہ پیش کردہ منظر کے منافی ہے۔

صفحہ ۶۴ پر ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

رات کو ڈوبے ہوئے خاموش تاروں کو پڑھا

جب تارے ڈوب جائیں تو پھر اُن کے پڑھنے کی کیا صورت ہے؟

صفحہ ۷۵ پر ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان "مغالطہ" ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:۔

حُسنِ اجل بکف کو تسکینِ روح جانا جامِ شفق میں سمجھا سامان تشنگی کا

پہلے مصرعہ میں "اجل" کی رعایت سے بجائے "تسکین روح" کے "اسباب زیست" لکھنا زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں ایک عجیب غلطی ہے۔ مقصود تو کہنا یہ ہے کہ جامِ شفق میں "تشنگی" بجھانے کا سامان نظر آیا لیکن "سامان تشنگی" کہکر مفہوم کو بالکل اُلٹ دیا۔

اسی نظم میں ایک جگہ "خود غرضی" بسکون "را" استعمال کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ صحیح بہ فتح "را" ہے۔

صفحہ ۷۶ پر ایک نظم "شاعر کا دل" نظر آتی ہے۔ اسکا آخری شعر ہے:۔

عرش کی خلوت سے جب فطرت کا دل گھبرائے گا عرش تیرا ہی دل بلا ہنوز مغلط ہے۔ اس لئے یہاں

[illegible] ہے "بین جہانگ" میں نے غور کیا ہے۔ اس قسم کا محاذ قائم کرنا یہاں مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ

لیکن یوں کوئی تفریق پیدا نہیں ہوتی۔

صفحہ ۸۰ ا پر ایک شعر ہے:۔

ابر کی آغوش سے قطرہ جو نکلا بے قرار گرمیٔ فطرت نے اس کو کر دیا جذبِ شرار

دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ ابر سے جب قطرۂ باراں نیچے آتا ہے تو وہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے یا بہ جاتا ہے۔ شرار سے اسکا کیا واسطہ۔

صفحہ ۸۵ ا پر ایک جگہ "زوال اندوز" لکھا گیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ اور صفحہ ۸۸ ا پر ایک جگہ بجائے "حیاتِ دائم" کے "احیائے دوام" نظم کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ صفحہ ۸۹ ا پر ایک مصرعہ ہے:۔

فطرتاً ہوتا ہے شاعر مائل و مجبورِ خواب

مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کی ترکیب بالکل غلط ہے۔ "مائلِ خواب" کہتے یا "مجبورِ خواب"۔ مائل و مجبور دونوں کو حرفِ عطف سے وابستہ کر کے مضاف قرار دینا درست نہیں۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی غلطیاں ہیں جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ اور ایک ایسے شخص کے کلام میں ان کا پایا جانا جو اپنے آپ کو "ہندوستان کا شاعرِ اعظم" کہلانا پسند کرتا ہے۔ یقیناً حیرتناک ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سیماب صاحب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس دور کے اچھا کہنے والوں میں سے ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو صرف غزل گوئی تک محدود رکھتے اور نظموں کے خارزار میں نہ الجھتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ زیادہ کہنے اور تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے سے بدرجہا بہتر صرف ایک صنف کو لیکر اس میں کمال پیدا کرنا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اگر سیماب صاحب اپنی توجہ تمام تر صرف تغزل پر صرف کرتے تو آج ان کا مرتبہ ابنائے شاعری میں اس سے زیادہ بلند رہتا۔

ماہ آیندہ کے نگار میں

"دیر و حرم کے قصے" اور "مصطفٰے کمال" دونوں ختم ہو جائیں گے۔ اور

ایک ڈرامہ "جھانسی کی رانی"

... ترے دل میں ہے ...

کیا جانے کیا کرے جو خدا اطمینان دے

باب المراسلۃ والمناظرہ

مذہب شکن سوسائٹی

(جناب سید تہور علی صاحب - دلدار نگر)

آپ نے اکثر اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ مذہب کی وجہ سے خونریزی ہوئی اور جب تک اس کا وجود دنیا میں باقی ہے - امن وسکون قایم نہیں ہو سکتا - اس لئے کیوں نہ آپ ایک مذہب شکن سوسائٹی کی بنیاد قایم کرکے لوگوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دیں - اور ایک اخبار یا رسالہ مخصوص اسی مقصد کیلئے جاری کرکے ملک میں پروپاگنڈا کریں -

---

(نگار) میں آپ کے لب ولہجہ سے مطلق اندازہ نہیں کر سکا کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں طنز شامل ہے یا واقعی آپکا مقصود وہی ہے جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے - تاہم چونکہ بات دلچسپ ہے - اس لئے بلا لحاظ اس امر کے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا سننا چاہتے ہیں - مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہوں -

بالکل یہی مشورہ اس سے قبل بعض اور احباب نے بھی دیا - لیکن نہ میں نے انھیں کوئی جواب دیا - اور نہ اُن کے ارشاد کی تعمیل کی طرف توجہ کی - اس کے کئی سبب ہیں - ایک یہ کہ مذاہب عالم جس دور سے گذر رہے ہیں - اس میں بہ لحاظ تمدن و معاشرت اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے - اور اگر اہل ہند یا ایشیا کی بعض اور مذہب زدہ قوموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو نمایاں طور پر محسوس ہوگا کہ مذہب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے - کیونکہ علم وتمدن کی ترقی نے اس کے لئے کوئی جائے قرار باقی نہیں رکھی - اور عقول انسانی اس عہد طفولیت سے گذر چکی ہیں جب صرف جنت کے کھلونوں اور دوزخ کے تازیانوں سے انسان بہلایا اور ڈرایا جاتا تھا - البتہ ہندوستان میں چونکہ قدامت پرستی وجہل کی بلا ہنوز مسلط ہے - اس لئے یہاں اس ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے - لیکن جہانتک میں نے غور کیا ہے - اس قسم کا محاذ قائم کرنا یہاں مفید نہیں ہو سکتا - کیونکہ

اول تو حکومت خود اسکو پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ مذہبی تصادم و اختلاف اس کی بقا کا بڑا زبردست راز ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جب تک خود کوئی قوم ترقی علوم کے مدارج طے کرکے اپنے اندر مذہب کی طرف سے احساس بیزاری پیدا نہ کرے دوسروں کے سمجھانے سے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بجائے "مذہب شکن سوسائٹیاں" قایم کرنے کے زیادہ اصولی تدبیر یہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت میں مدد کی جائے۔ اور علوم جدیدہ کی ترویج سے ذہن انسانی کو ترقی یافتہ بنایا جائے۔

علاوہ اس کے ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے مذہب کے خلاف پروپاگنڈا یوں بھی خلاف دانشمندی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے جس ملک میں ایسے دو متضاد مذاہب پائے جاتے ہوں۔ وہاں اگر صرف ایک جماعت نے اپنے مذہبی تقشف یا مذہبی اصول کو ترک کیا اور دوسری جماعت بدستور ویسی ہی سخت و متعصب بنی رہی تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تارکِ مذہب جماعت فنا ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس کوئی ذریعہ مقاومت کا باقی نہ رہیگا۔

جن ممالک میں اختلاف مذاہب اتنا شدید نہیں ہے اور تہذیب و معاشرت ایک ہے۔ وہاں تو دینی اور بے دینی دونوں صورتوں میں اتحادِ عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں مذہب کیساتھ تہذیب و تمدن بھی مختلف ہو۔ قومیت و وطنیت کا جذبہ بھی عام نہ ہو وہاں تو مذہب یا کسی ایسے نظام کا پایا جانا ضروری ہے۔ جو مختلف جماعتوں اور خصوصیت کے ساتھ چھوٹی جماعتوں کے افراد کو کسی ایک شیرازہ سے والبتہ رکھے۔

یورپ میں اول تو کوئی اختلاف مذاہب پایا ہی نہیں جاتا اور اگر یہودیوں کو بہ حیثیت ایک مذہبی جماعت ہونے کے نصاریٰ سے بالکل مختلف قرار دیں تو بھی یہ اختلاف ان کی عملی زندگی پر موثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی تہذیب و معاشرت اور اُن کے خاندانی روایات علم و عمل بالکل ایک ہیں اور اس صورت میں اگر وہاں کوئی جماعت تارکِ مذہب ہو جائے تو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر ہندوستان میں آج مسلمان ترکِ اسلام کر دیں اور ہندو اپنے حال پر قایم رہیں تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح مذہب کی پابندیوں سے مسلمان آزاد ہو سکتا ہے۔ کیا اسی طرح ہندو نہیں ہو سکتا۔ اور جب دونوں مذہب کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں گے تو یقیناً اُن میں اتحادِ عمل پیدا ہو جائیگا۔ لیکن ایسا سوال کرنا ہندو ذہنیت۔ ہندو مذہبیت اور ہندو معاشرت سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔

ہندوؤں کی اجتماعیت حقیقتاً مذہب سے والبتہ نہیں ہے اور نہ ہندو نام ہے کسی مذہب کا۔ بلکہ وہ سوسائٹی کی ایک خاص تنظیم ہے۔ معیشت و معاشرت کا ایک متعین لائحہ عمل ہے اور ایک ایسی مخصوص ذہنیت ہے جو یہاں کے ماحول سے پیدا ہوئی اور ہمیشہ یہیں کے ماحول سے والبتہ رہیگی۔ اس لئے ہندوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خوشی سے بغیر کسی اثر کے ترکِ مذہب کر سکتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اسکیمو قوم کے افراد سے یہ آرزو رکھنا کہ وہ اپنی سمور کی پوشش سے کسی وقت بیزار ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان بہ لحاظ وطنیت و قومیت کے ہندوؤں سے کسی طرح مختلف نہیں لیکن

یہ بھی واقعہ ہے کہ اپنی تہذیب اپنی معاشرت اور اپنی ذہنیت کے لحاظ سے وہ ہندوؤں سے بہت مختلف ہیں۔

اسلام کی یہ خصوصیت کہ وہ جہاں گیا اپنی ذہنیت و تہذیب اپنے ساتھ لے گیا اور بلالحاظ نسل و قوم۔ ملک و ملت جس کو چھو لیا اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ہندوستان بھی ساتھ آئی اور جو لوگ یہاں مسلمان ہوئے اُن کی تہذیب و معاشرت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اس لئے جس طرح اب یہاں کے ہندوؤں سے اُن کی مخصوص ذہنیت فنا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح مسلمان بھی اپنے کلچر کو ترک نہیں کر سکتے۔ اور بالفاظ دیگر اسکے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان ترکِ اسلام کے بعد بھی ہندو نہیں ہوسکتا۔ اور ہندوؤں کے ترک مذہب کی وہ صورت باقی نہیں جو حکومتِ اسلامی میں پائی جاتی تھیں۔ کہ وہ اسلامی تہذیب اختیار کر کے مسلمانوں سے متحد ہوسکیں۔

الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے پناہ اسی میں ہے کہ وہ مذہب کو ہاتھ سے نہ دیں۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اسلام کے صحیح مفہوم کا پروپاگنڈا کر کے اپنی اخلاقی و ذہنی برتری کو ہندوؤں سے تسلیم کرالیں۔ علی الخصوص ایسے وقت میں کہ ہندو قوم اپنے جدید دورِ نہضت (Renaissance) میں مغرب کے بعض پست و فرومایہ اخلاق قبول کرنے کی طرف مائل نظر آرہی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ سب سے بڑی وجہ اس رائے کے قبول نہ کرنے کی میرے لئے ایک اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جن مقاصد بلند کو سامنے رکھ کر دنیا سے مذہب کے وجود کو محو کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے وہ میری رائے میں اسلام سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں۔ اور اسی لئے میں نے ہمیشہ اسلام کا مفہوم "اخلاق بغیر پابندی مذہب" (Morality without religion) قرار دیا ہے۔ اور ہر چند بظاہر یہ بالکل نئی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کا ماحصل صرف درستیٔ اخلاق ہے۔ اور ترک مذہب کی بڑی سے بڑی برکت اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف یہی۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوئم

کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور اس جلد میں اس وقت تک کے تمام استفسار و جواب شامل کر دیئے جائیں گے تاکہ تیسری جلد کی ضرورت نہ رہے۔ اسکا حجم غالباً ایک ہزار صفحہ سے کم نہ ہوگا۔ قبل اشاعت اس کی رعایتی قیمت چار روپیہ معہ محصول رکھی گئی ہے۔

منیجر نگار

باب الاستفسار

رسول اللہ اور تعداد ازدواج

(جناب علی حسن خاں صاحب - تلہر)

جب سے آپکا رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے اُس وقت سے برابر میرے مطالعہ میں رہا ہے اُس کے مضامین بڑی قدر و منزلت سے پڑھتا ہوں - اسلام اور بانی اسلام کے متعلق جو خیالات آپ رکھتے ہیں اس سے بھی واقف ہوں - مہربانی فرماکر یہ تو بتلایئے کہ رسول اللہ نے جو اس قدر نکاح کر ڈالے تھے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے -

---

(نگار) یہ مسئلہ ہمیشہ سے غیر مسلم لوگوں کا مرکز توجہ رہا ہے - اور بارہا اس اعتراض کا جواب بھی دیا گیا - لیکن اس باب میں میرے نزدیک دونوں جماعتوں نے غلطی کی ہے - اور جس طرح معترضین نے رسول اللہ کی سیرت اور اُس وقت کے حالات پر غور نہیں کیا - اسی طرح مسلمانوں نے جواب دینے میں اپنی قدامت پرستانہ ذہنیت کا ثبوت دیا -

معترضین نے ہمیشہ رسول اللہ کی تعداد ازدواج کو اُن کے جذبہ نفسانی پر محمول کرنا چاہا اور مسلمانوں نے ہمیشہ تعداد ازدواج کو ایک رحمت و برکت قرار دیکر ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے ضروری قرار دیا حالانکہ نہ رسول اللہ نے جذبۂ شہوت پرستی کے ماتحت اتنے نکاح کئے اور نہ اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے - کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا مستحسن سمجھا جائے اگر زمانہ کا اقتضاء اس کے خلاف ہے -

جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے - یہ وہ عہد تھا جب عرب میں عورت کوئی حیثیت و عزت نہ رکھتی تھی - اور اس کیساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو وحوش و بہایم کیساتھ - اور ادارۂ نکاح کی وسعت کا یہ حال تھا کہ ایک مرد اگر سَو پر بھی بسر نہ کرتا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا - ظاہر ہے کہ یہ مذموم عادت دفعۃً دُور نہیں ہوسکتی تھی اور نہ اصلاح کا کام

یوں یکبارگی ہوا کرتا ہے۔ پھر غور فرمایئے کہ رسول اللہ نے جتنے نکاح کئے ہیں ان میں کیا ضرورت و مصلحت پنہاں تھی بعض سے آپ نے صرف اس لئے شادی کی کہ عورت کی پوزیشن پر اسکا اثر پڑے اور بعض سے اس لئے کہ تبلیغی و اصلاحی سرگرمیاں قایم رہ سکیں۔

آپ نے اتنی شادیاں کس مجبوری سے کیں اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آیندہ کے لئے صرف چار تک اُن کی تعداد محدود کردی۔ اور وہ بھی ایسے سخت شرائط کے ساتھ کہ بیک وقت ایک نکاح کرنے سے زیادہ کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی۔

پھر چونکہ معاشرت کے احکام و قوانین میں ہمیشہ تغیر و تبدّل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے احکام شرعی میں کافی گنجائش اسکی رکھدی کہ ہر زمانہ میں اس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے ترمیم و تنسیخ ہو سکے۔

اہل مذاہب کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کے محامد و محاسن بیان کرتے وقت اسکا لحاظ نہیں رکھتے کہ اُس کا زمانہ کیا تھا اور اُس وقت کا اقتضاء زمانہ مابعد کے واقعات سے کس حد تک مختلف تھا۔ وہ ایک رسول یا نبی کے احکام کو ایسی مکمل چیز سمجھتے ہیں کہ کبھی کسی حال میں وہ تغیر پذیر نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ہر پیغمبر اپنے زمانہ کے حالات سے وضع قوانین کرتا ہے۔ اور اسکے سامنے مستقبل کا کوئی سوال نہیں ہوتا......... اس کی تعلیم کی تکمیل کا ثبوت یہی ہے کہ وہ احکامِ شرع میں زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی اجازت دے اور غالباً یہی وہ خصوصیت اسلام و صاحبِ اسلام کی ایسی ہے جس میں دُنیا کا کوئی دوسرا مذہب یا پیغمبر شریک نظر نہیں آتا۔

اگر رسول اللہ نے متعدد شادیاں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس وقت اس سے زیادہ اصلاح ممکن نہ تھی۔ اور آیندہ کیلئے مخصوص شرائط کیساتھ صرف چار کی اجازت دینا اس اصلاح میں ایک قدم اور آگے بڑھانا تھا۔ جس سے رسول اللہ کی انتہائی فراست و دانشمندی ظاہر ہوتی ہے ـــــ لیکن اب اگر حالات کا اقتضاء یہ ہو کہ صرف ایک شادی کی جائے یا بالکل نہ کی جائے تو اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ اسلام اس کی مخالفت کریگا بلکہ وہ علماء مذہب و مصلحین قوم کو مجاز و مختار بناتا ہے کہ

مصلحت بین و کار آسان کن

مکتوبات نیاز کی روانگی

جولائی کے پہلے ہفتہ سے شروع ہو جائیگی

(مینجر نگار)

مکتوباتِ نیاز

نگار کی اٹھائیسویں جلد میں یہ (حضرت نیاز نہیں بلکہ) میرا آخری خط ہے جسمیں کسی مخصوص شخص کے بجائے پوری جماعت کو مخاطب کر رہا ہوں اور یہ جماعت اُن تمام حضرات کی ہی جو نگار کو شرف مطالعہ بخشتے ہیں اور جن سے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا اخلاقی و روحانی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ اس لئے

میں اس تحریر کے ذریعہ سے اس رشتہ کو اور زیادہ مستحکم کرنا چاہتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ کوئی یادگار ایسی آپکے پاس رہے جو حضرت نیاز کی پرائیویٹ زندگی سے آپکو قریب تر کر دینے والی ہو اور وہ یادگار صرف مکتوبات نیاز ہیں۔

ابھی اسکی اشاعت کو پورا ایک مہینہ باقی ہی اور آپکے پاس کافی وقت ہے کہ اس یادگار کے حاصل کرنے یا نہ کرنیکا فیصلہ کرلیں۔ اگر آپ ادب و انشاء کے اس مجموعۂ نوادر کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو صرف آپکی خاموشی کافی ہے ورنہ تین پیسہ کا صرف گوارا کرکے مطلع فرما دیجئے کہ ہم اس کا وی پی آپکے نام روانہ کریں۔

منیجر نگار

ایجادات

معلومات

مجرم کی شناخت کا جدید طریقہ۔

موجودہ دور تہذیب و تمدن میں یہ کوشش جاری ہے کہ ان قوانین کا خاتمہ کر دیا جائے جن سے بربریت اور بہیمیت اظہار ہوتا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ابھی تک مجرمین کی گرفتاری اور شناخت کے وہی پرانے اور مذموم طریقے رائج ہیں جن سے غیر مجرم بھی مجرم قرار پا جاتے ہیں۔ مثلاً متہم کو تکلیف جسمانی پہنچا کر جرم کا اقبال کرایا جاتا ہے۔ اور اس وقت تک برابر یہ سلسلۂ اذیت جاری رہتا ہے کہ جب تک اقرار نہ کرے۔ یا کسی دوسرے کو مجرم نہ ثابت کرے۔

لیکن سائینس داں حضرات اس طرف سے غافل نہ تھے اور آخر کار انہوں نے ایسے طریقے دریافت کر ہی لئے۔ جن کے ذریعہ سے بہ آسانی اصل مجرم کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اجراء کے بعد انسداد جرائم میں بہت مدد ملیگی۔ کیونکہ یہ طریقے تجربہ کے بعد اس قدر صحیح ثابت ہوئے ہیں کہ اس کے بعد مجرمین کو کسی قسم کے حیلہ کی گنجائش باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وہ صریح الفاظ میں اپنے جرم کے اقبال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان طریقوں کو مختصر تعارف کے بعد درج کرتے ہیں:۔

پولیگراف (POLYGRAPH)

یہ آلہ اطباء کے اس آلہ سے بہت مشابہ ہے جس سے خون کی حرارت اور اس کے آتار چڑھاؤ کو دریافت کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پولیگراف میں ایک قلم ہوتا ہے جو خطوط کے میلان کو کاغذ پر لکھتا جاتا ہے۔ یہ خطوط خون کے آتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسان پر جس قسم کے انفعالات طاری ہوتے ہیں اسی مناسبت سے اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ جب اس سے کسی جرم کے متعلق استفسار کیا جاتا ہے۔ تو اگر وہ اسکا حقیقت میں مرتکب ہوتا ہے تو خوف کیوجہ سے اس کے اندر عجیب و غریب انفعالات طاری ہوتے ہیں۔ پولیگراف ان تمام تغیرات اور حالات کو محفوظ کر لیتا ہے۔ جس سے مجرم کی اندرونی حالت کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔

بعض مجرم کثرتِ جرم یا اپنے اندر غیر معمولی صبر کی وجہ سے جرم کے اخفاء پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے اوپر کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دیتے مگر باوجود اسکے قدرتی طور پر اُن کا دوران خون نہایت تیز ہو جاتا ہے اور نہایت سرعت کیساتھ رگوں میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور یہ سرعت ہی درحقیقت مجرم کی پہچان ہے۔ جسے یہ آلہ نہایت خوبی کیساتھ کاغذ پر منتقل کر کے بتلا دیتا ہے۔

اس آلہ کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ حادثوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوا۔ لیکن باوجود اس کے اسکا استعمال بہت قلیل ہے۔ امریکہ کی بعض کمپنیوں اور بنکوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ چیکاگو کے ایک بنک کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہاں سے پانچ ہزار ڈالر غائب ہوگئے۔ ۵۶ ملازمین پر اسکا تجربہ کیا گیا تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے۔ اور بعد کو سب نے بغیر کسی اکراہ کے اپنے جرم کا اقبال کیا۔ اس کے بعد سے ہر سال بنک مذکور میں اس کے ذریعہ تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر جب اسے استعمال کیا گیا تو اسکا نتیجہ صحیح ثابت ہوا۔

سائیکو گلوینو میٹر (PSYCHO GALVANO METAR)

اس آلہ کا موجد ایک راہب ہے۔ اس آلہ میں بجلی کی خفیف سی شعاع ہوتی ہے۔ جو بیٹری سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اسے متہم پر لگا کر اس سے سوالات کئے جاتے ہیں تو اگر وہ مجرم ہوتا ہے تو اسکا بدن پسینہ سے تر ہو جاتا ہے۔ جس قدر پسینہ پیدا ہوگا اسی مناسبت سے بجلی کی شعاع جو تمام بدن میں پھیلی ہوتی ہے کم ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ اس مقدار کو محفوظ کر لیتا ہے۔ جس سے مجرم کا پتہ چلتا ہے۔

بذریعہ سائیکالوجی (PSYCHOLOGY)

علم النفس کے ذریعہ سے بھی تحقیق کی جاتی ہے۔ کیونکہ ماہران علم النفس نہایت آسانی سے مجرم کو پہچان لیتے ہیں چنانچہ اسی بناء پر جاسوسوں کے لئے علم النفس کا جاننا نہایت ضرور ہے مگر چونکہ اس میں غلطیاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لئے چنداں قابلِ توجہ نہیں۔

نیوموگراف (PNEUMAGRAPH)

علم النفس کا یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ جب مجرم سے استفسارات کئے جاتے ہیں تو اس کے تنفس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ تیزی ہی درحقیقت اس کے جرم کو ظاہر کر دیتی ہے یہ آلہ پولیگراف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسکا کام صرف یہ ہے کہ تنفس کی رفتار کو صحیح طور پر بتلا دے۔ اسکے تجربہ کرنیوالوں کا خیال ہے کہ اس سے کبھی بھی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔

اُوپر جتنے آلوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے ان سب کا انحصار انفعالات پر ہے۔ مگر بہت سے مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جو کثرت جرم کے باعث جرم کے پوشیدہ رکھنے پر پوری قوت رکھتے ہیں اور اُن کے قلوب اس قدر مُردہ ہوجاتے ہیں کہ وہ اپنے اُوپر کسی قسم کا انفعال طاری نہیں ہونے دیتے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ آلے بالکل بیکار ثابت ہونگے۔

سائینس نے جہاں اس قسم کے آلوں کی ایجاد کی وہاں اس خرابی کے انسداد کا بھی طریقہ ایجاد کیا ہے۔

اس قسم کے مجرمین کو ایک دوا استعمال کرائی جاتی ہے۔ جسے "سکوپولامن" (Scopolamin) کہتے ہیں۔ یہ دوا قطعی بے ضرر اور غیر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسکی خاصیت یہ ہے کہ یہ دماغ کے اُس حصہ کو جسے مرکز کذب کہا جاتا ہے بالکل بیکار کردیتی ہے۔ جس کے بعد انسان جھوٹ بولنے پر قادر نہیں رہتا۔

کونیل گوڈرڈ نے جو کہ مسئلہ جرائم میں بہت بڑے ماہر ہیں۔ بارہا اس دوا کا تجربہ کیا ہے۔ اسکا قول ہے کہ اسکا نتیجہ کبھی غلط نہیں ظاہر ہوا۔ اور اسکے ذریعہ سے ہمیشہ وہی مجرم ثابت ہوا جو حقیقت میں مجرم تھا۔

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ اسکا اثر دماغ کے مرکز کذب پر نہایت شدید ہوتا ہے اس لئے وہ بالکل کمزور ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد مجرم کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ وہ واقعہ کو اصلی صورت میں پیش کردے۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں اسکے اعجاز کا ایک واقعہ بیان کردیں۔

مسٹر ڈیلیغز امریکہ کے محکمۂ قضاء کے ایک بڑے عہدہ دار ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چودہ اشخاص پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ انھیں سکوپولامن استعمال کرائی گئی۔ تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے۔ موصوف کا بیان ہے کہ محکمہ نے محض ان کے اعتراف ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ جب دیگر ذرائع سے بھی تفتیش کی گئی تو یہ واقعہ صحیح ثابت ہوا۔ ظاہر ہے اس قدر شہادتوں کے بعد اسکی صحت پر کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اس دوا کے استعمال کے بعد اس قدر قطعی نتائج برآمد ہوتے ہیں تو اسے عام طور پر مجرمین کی شناخت کے لئے کیوں نہیں استعمال کیا جاتا؟

عبداللطیف اعظمی

آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو

بلالحاظ اس کے کہ اسکا اشتہار نگار میں درج ہے یا نہیں یا یہ کہ وہ کس فن سے تعلق رکھتی ہو سب سے پہلے آپ اسکے متعلق دفتر نگار سے استفسار کیجئے۔ کیونکہ علاوہ اپنی مطبوعات کے دوسروں کی مطبوعات بھی یہاں سے فراہم کی جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی خاص فن یا موضوع پر بہترین کتابیں چاہتے ہیں تو بھی ہم سے مشورہ کیجئے ہم آپکو مفید کتابوں کی فہرست بھیجکر بتائیں گے کہ کون کتاب کس حد تک مفید ہے۔ - مینیجر نگار

مطبوعات موصولہ

نغمۂ کہسار

شملہ میں ایک انجمن بزمِ اُردو کے نام سے قایم ہوئی ہے جس کا مقصد اُردو زبان کی خدمت ہے۔ اسی سلسلہ میں کبھی کبھی صحبتِ مشاعرہ برپا کرنا بھی اس انجمن کے مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں ایک بزمِ شعر خوانی منعقد کی گئی۔ اور تقریباً ۳۲ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ چونکہ نہ مصرعِ طرح کی قید تھی اور نہ غزل و نظم کی تخصیص۔ اس لئے یہ صحبت عام مشاعروں سے زیادہ دلچسپ رہی۔

ان نظموں اور غزلوں کے مجموعہ کو اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ جو سیکرٹری بزمِ اُردو شملہ سے پانچ آنہ میں مل سکتا ہے۔

مسیح الاطفال

یہ کتاب فنِ طب سے متعلق ہے۔ جس میں بچوں کی پیدائش سے لیکر ایامِ رضاعت ختم ہونے تک ان کے تمام امراض کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور نیز یہ کہ کس بیماری میں کس وقت کیا دوا دینا مناسب ہے۔ اسی کے ساتھ بچوں کے قیامِ صحت کے لئے اور جتنی تدابیر کی ضرورت ہے وہ بھی اس میں بیان کر دی گئی ہیں۔ چونکہ اس کے مؤلف حکیم مولوی محمد نسیم الدین صاحب خود ایک تجربہ کار طبیب ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا وہ یقیناً مفید و کارآمد ہوگا۔

یہ کتاب صدیقی دواخانہ کھاتولی ضلع مظفر نگر سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی اے رسالہ ہمایوں کے جوائنٹ ایڈیٹر پنجاب کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھیں کے کلام سے جناب منصور احمد صاحب نے سو شعر انتخاب کر کے اس نام سے شائع کئے ہیں۔ ابتداء میں جناب حامد کی خصوصیات شاعری پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ جو کافی دلچسپ ہے۔ انتخاب کے متعلق اس وقت تک کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جا سکتی۔ جب تک شاعر کا سارا کلام سامنے نہ ہو۔ تاہم بعض شعروں سے مادح و ممدوح دونوں کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:۔

جب یاد کیا اُس کو تب جان پہ بن آئی ۔۔۔ یا اُس کو بھلاؤں گا یا جان سے جاؤں گا

تجھے بھلا رہا ہوں میں یہ کیا خیال ہے مجھے ۔۔۔ غضب کا سنگدل ہوں میں عجیب بیوفا ہوں میں

مسلمانوں کی صنعت و حرفت

فون کرامر (مشہور جرمن مستشرق) نے ایک کتاب عہد خلفاء کی تاریخ تمدن پر لکھی ہے۔ جس کا ایک باب مسلمانوں کی صنعت و حرفت۔ زراعت و تجارت سے متعلق ہے۔ مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ اسلامی عثمانیہ یونیورسٹی نے اسی باب کا ترجمہ اسی نام سے شائع کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بہایت مفید معلومات کا حامل ہے۔ ترجمہ بہایت سلیس و پاکیزہ ہے۔ اور کتابت و طباعت پسندیدہ۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔ اور "کتابستان سٹی روڈ الہ آباد" سے مل سکتی ہے۔

کارخانہ جلد سازی حیدرآباد

محبوبیہ کارخانہ جلد سازی گولیگوڑہ حیدرآباد نے ہمارے پاس جرمنی کے چھپے ہوئے دیوان غالب کا ایک نسخہ بھیجا ہے تاکہ ہم اسکی جلد کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور یہ کہنا یقیناً خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ اتنی خوبصورت و پاکیزہ جلدیں نے اس وقت تک ہندوستان کے کسی انگریزی کارخانہ کی بھی نہیں دیکھی۔

یہ کارخانہ عرصہ سے قائم ہے اور اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کو اس فن کی تعلیم دیتا ہے اور مستحق طلباء کے وظائف کا بھی انتظام کرتا ہے۔ حلقۂ "نگار" میں جن حضرات کو کبھی جلد بندھوانے کی ضرورت ہو تو وہ ضرور اس کارخانہ سے خط و کتابت کریں۔

انقلاب فرانس

مصنفہ جناب باری۔ پبلشر اردو بک اسٹال لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ تقطیع چھوٹی۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔

یہ ہیں ظاہری خصوصیات اس کتاب کی۔ لیکن معنوی خصوصیات اس سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ جس اختصار و ایجاز اور جس شگفتگی و سلاست کیساتھ دنیا کے اس عظیم الشان انقلاب کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اردو کی کسی اور کتاب میں (اس موضوع پر) نہیں پایا جاتا۔ ملک کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں کا بغور مطالعہ کریں اور ملک و وطن کی خدمت کا وہی جذبہ اپنے اندر پیدا کریں جو انقلاب فرانس کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔

قادیانی مذہب

تصنیف ہے جناب الیاس برنی کی۔ جو پہلے جامعۂ عثمانیہ میں استاد معاشیات تھے اور اب دارالترجمہ کے ناظم ہیں۔ یہ ایڈیشن اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اور غالباً یہ کافی ثبوت اس کتاب کی مقبولیت کا ہے۔ اس ایڈیشن میں بہ نسبت سابق ایڈیشنوں کے مضامین کا کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ اور کچھ ضمیمے بھی بڑھائے گئے ہیں۔ ضخامت ۶۰۰ صفحات ہے اور قادیانی مذہب کے متعلق شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو اس میں درج نہ ہو۔ ہر چند اس کتاب میں کوئی مناظرانہ دلچسپ اندازِ بیان نہیں پایا جاتا۔ لیکن طرز ادا کی سلاست مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین کرنیوالی ہے اور وہ حضرات جو ہندوستان کے اس جدید سیاسی مذہب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کیلئے اسکا مطالعہ ہر نوع فائدہ سے خالی نہیں۔ اسکی قیمت علاوہ محصول دو روپیہ ہے۔ اور کمال احمد صاحب فاروقی (بیت الاسلام حیدرآباد دکن) سے مل سکتی ہے۔

شاعر کی دُنیا

وہ گرمیوں میں شبِ مہ کی سرو سیمینی
وہ برشگال میں شام و سحر کی رنگینی

وہ جھوم جھوم کے گھنٹوں برسنے والی گھٹا
جو بزمِ طبع مست کو دیتی ہے درسِ بے دینی

وہ نے نواز کے پُرکیف زمزموں کا لوچ
وہ نغمہ گر کے رسیلے سُروں کی شیرینی

جوانیاں، وہ چھلکتے ہوئے شراب کے جام
وہ گیسوؤں کی دمک وہ رُخوں کی زرّینی

وہ گردنوں کی نزاکت، وہ ابروؤں کا کھچاؤ
وہ انکھڑیوں کی گلابی خمار آگینی

کسی کے عشق میں وہ نامرادیوں کے مزے
وہ نوجوان طبیعت کی یاس آگینی

سکوتِ شب میں وہ بچھڑے ہوئے دنوں کی یاد
جو دل کو بخشتی ہے اک لطیف غمگینی

وہ عین اٹھتی جوانی میں موت آجانا
وہ باغِ زیست میں دستِ فنا کی گلچینی

یہ زندگی کے ہلاکت فروز منظر ہیں
انہی کے مارے ہوئے کیٹس اور اختر ہیں

(اختر انصاری)

نغمۂ شاعر

نبضِ گیتی میں ہوا ہے سست رَو خونِ حیات
بے خبر پردہ سرائے شب میں سوتا ہے جہاں
محفلِ ہستی پہ یعنی چھا گیا خوابِ اجل
کتنی گہرائی ہے شب کے نغمۂ خاموش میں
اہلِ عالم سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے
نور کی چادر کو اوڑھے سو رہی ہے رات بھی
آہ! لرزاں ہے مگر میرا رُبابِ جاں ابھی
جاگتا ہوں میں زمانے کو سُلانے کے لئے
ذوقِ وجد انگیز میں بیٹھا ہوں سرشارِ خیال
جاگ اٹھے ہیں ہزاروں زمزمے اب خواب سے
سوز ہے سینہ میں آہوں سے عیاں ہوتا نہیں
شرحِ دردِ زندگانی ہے کتابِ آرزو
دِل اگرچہ قطرۂ خوں ہے مگر طوفان ہے
میرے بربط میں جو نغمے ہیں ابھی گائے نہیں
دل ہے کیا شاعر کا؟ صوتِ سرمدی کا ساز ہے
خواب سے تم کو جگانے کے لئے آیا ہوں میں

گردشِ پیہم سے گویا تھک چکی ہے کائنات
گویا انساں کو نہیں اندیشۂ سود و زیاں،
روح کی گہرائیوں میں سو گیا ذوقِ عمل
زندگی سوتی ہے گویا موت کی آغوش میں
شورشِ ہنگامۂ ہستی سے گھبرائے ہوئے
رُک گئی ہے سرد ہو کے نبضِ موجودات بھی
برقِ بیتابی مرے سینہ پہ ہے رقصاں ابھی
جل رہا ہوں آگ اوروں کی بجھانے کے لئے
نشۂ خواب آفریں میں ہوں پرستارِ خیال
سازِ دل کو چھیڑتا ہوں فکر کی مضراب سے
شمع اس محفل میں جلتی ہے دھواں ہوتا نہیں
تشنۂ مضراب ہے میرا ربابِ آرزو
سینکڑوں خوں گشتہ امیدوں کا گورستان ہے
میں نے بادہ کش ابھی محفل کے بہکائے نہیں
شعر کیا؟ پردہ سرائے قدس کی آواز ہے
"نغمۂ الفت" سنانے کے لئے آیا ہوں میں

آگ نغموں کی میں اپنے ساز سے برساؤں گا
ابر بن کے آسمانِ شعر پہ چھا جاؤں گا

شفیع منصور - لدھیانہ

"نوائے غریب"

تصوّر کس قدر آزاد ہے خوابِ پریشاں کا
معرا ہے حقیقت سے تماشہ اہلِ امکاں کا

مری فطرت میں آزادی کے جلوے رقص کرتے ہیں
مرے اندازِ گوناگوں مصیبت میں نکھرتے ہیں

عنایت ہائے ساقی کا گلہ میں کر نہیں سکتا
تکاپوئے زمانی برطرف۔ میں مر نہیں سکتا

کرم کر مجھ پہ اے ساقی مجھے آزاد رہنے دے
"میں بربادِ تمنّا ہوں مجھے برباد رہنے دے"

مری کاوش سے پیدا ہے شرارِ آرزو دل میں
شرر آہنگیاں میری نہ چھوڑیں گی لہو دل میں

جمالِ شاہدِ گیتی نظر افروزِ عالم ہے
مگر قسمت مری وابستۂ اجزائے برہم ہے

مجھے فرصت نہیں شانِ امارت کے تکلّف کی
مجھے حاجت نہیں انبارِ دولت پر تصرف کی

تلاشِ زندگی میں عمرِ فانی کھو چکا ہوں میں
جہاں میں بندۂ بے دامِ الفت ہو چکا ہوں میں

"محبت" چھا گئی ہے میری دنیائے تمنّا پر
زمانہ ہنس رہا ہے میری "لیلائے تمنّا" پر

نمودِ حسن کی نیرنگیاں، واللہ! کیا کہنا!
مگر میرے مقدّر کی رسائی، آہ! کیا کہنا!

زبانِ بے زبانی کی شکایت کر نہیں سکتا
فروغِ ظاہری سے میں محبّت کر نہیں سکتا

مری بیتابیاں اک دن نمایاں ہونگی محفل میں
تجلّیاتِ لرزاں کھو گئی ہیں میری منزل میں

امیرِ محتشم کھویا ہوا ہے اپنی دولت میں؟
وقارِ معنوی حاصل ہے مجھ کو اک "محبّت" میں!

(تحسیم نعمانی نیازی)

تصانیف نیاز فتحپوری
صحابیات
تاریخ الدولتین
عرض نغمہ
فلاسفۂ قدیم
جذبات بھاشا
فراست الید
مکتوبات نیاز
مینیجر نگار لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

ایڈیٹر نگار کے ان ادبی مقالات اور افسانوں
کا مجموعہ جو اجرائے نگار سے قبل کے شائع شدہ
مقالات کا انتخاب ہے۔ اس مجموعہ کا تیسرا
ایڈیشن قریب ختم ہے
اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ
اس کے بعض مضامین کا ترجمہ ملک کی مختلف
زبانوں میں شائع ہوا اور بی اے کے کورس میں
اس کو داخل کیا گیا

قیمت ۲؎

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا
مجموعہ۔ اس میں ۳۲ افسانے ۔۔۔ کے
درج ہیں۔ زبان، انشاء، قدرت بیان
اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار
کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل
کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر
آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی
جگہ ایک معجزۂ ادب کی حیثیت
رکھتا ہے اور اردو لٹریچر میں
بے نظیر ہے

قیمت للعہ

شہاب کی سرگزشت

نیاز فتحپوری کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو
لٹریچر میں اس حیثیت سے پہلی چیز تسلیم کیا گیا ہے جو جذبات
نگاری اور تخیل جذبات کے ایسے ایسے نادر
نمونے اس میں نظر آئیں گے کہ کہیں دوسری جگہ مل ہی
نہیں سکتے۔ مسئلہ ازدواج اور اخلاق معاشرت
کے تمام اہم و نازک پہلوؤں پر اس خوبی اور
توضیح کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ ایک بار اسکو
دیکھ لیا گویا انسانی حیات کی غایت کو سمجھ لیا ہے

قیمت عہ

استفسار و جواب

مجموعہ استفسار و جواب ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک کا
یہ جلد اول ہے جس میں ۔۔۔ شامل ہیں باقی جلدیں
زیر طبع ہیں۔ استفسار و جواب نگار کی اہمیت پر اظہار بیکار ہے
اس مجموعہ کی خصوصیت اس باب میں خاص
کیونکہ نگار کو جو خصوصیت ۔۔۔
ہو کسی سے مخفی نہیں۔ اس مجموعہ میں ۔۔۔ گفتگو کی گئی
تاریخی ادبی و مذہبی مسائل پر ۔۔۔
ہے اور اس میں ۔۔۔ انسائیکلوپیڈیا کا ہر اہل علم
کی میز پر رہنا ضروری ہے

قیمت ۳ے

ترغیبات جنسی

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں
کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت
شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور
بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب سے اور کیونکر رائج
ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج
میں کہاں تک مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو ایسے ایسے
حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے کہ آپ دیکھکر
حیران رہ جائینگے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ
پہلی کتاب ہے

قیمت ۔۔۔

منیجر نگار لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴